مرکزی مجلس رضا ○ لاہور

امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کا ترجمان، اخلاقی، ادبی، تمدنی جریدہ

ماہنامہ

جہانِ رضا

لاہور

جلد نمبر 28، شوال المکرم، جون 2021، 1442ھ، شمارہ 244

بانی مجلس رضا: حکیم اہلسنّت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

بانی ماہنامہ: پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

● چیف ایڈیٹر: محمد کاشف رضا ● ایڈیٹر: عامر ابراہیم الاشعری

قیمت -/50 روپے

خط و کتابت اور ملنے کا پتا

دفتر ماہنامہ جہانِ رضا ظہور پلازہ
دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور
0333-7861895 - 0300-1090045

اداریہ

مدارس اور دانشوران عصر

محمد کاشف رضا

دین کو''بازیچہ اطفال'' بنانے والے دانشورانِ عصر کس قدر مضحکہ خیز بیانات اور تحریریں پیش فرماتے ہیں کہ ناطقہ سر بہ گریباں اور خامہ اُنگشت بدنداں ہوا جاتا ہے۔ فرقہ واریت کے خاتمے کے لئے ایسی ایسی اصلاحات انکے بنجر ذہن سے سیم زدہ ہوکر نمودار ہوتی ہیں کہ الامان والحفیظ،فرقہ واریت کی تاریخ، اسباب اور محرکات کا سطحی علم رکھنے کے باعث انکی فکر نابالغی کے جھولے جھولتی ہے۔ کچھ دل کی کجی کے ہاتھوں مجبور افکارِتازہ سے وضو کرتے ہیں کہ جدید کہلائیں گے۔''قدامت پسندی'' سے نفرت اس لئے بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ بنیاد پرست ہونے کا طعنہ نہ مل سکے۔نظری وفکری پرا گندگی کا شکار''دانشورانِ عصر'' وحدت اُمت کا نعرہ بلند کئے''وارثانِ دین'' ''رہنمایانِ ملت'' پہ تنقید کے پتھر مارتے ذرا بھی نہیں شرماتے۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے جب اپنا جال بچھایا اور نوبت 1857ء کے''جہاد'' تک جا پہنچی، برٹش گورنمنٹ کا قبضہ ہو گیا۔توپ سے باندھ کر علماء وصوفیہ اور درد مندانِ ملت کو شہید کیا گیا۔کالے پانی کی سزائیں اور پھانسیاں دی گئیں تب ایسے ہی دانشور مسلمانوں کو مشورہ دیتے تھے کہ سرکارِ برطانیہ کی اطاعت کی جائے، انکے علمی افکار کو اپنایا جائے، انکی تہذیب وثقافت میں خود کو رنگ لیا جائے۔ یہی لوگ اسلام کے نام لیواؤں کو غدار و باغی قرار دیتے تھے۔دانشِ افرنگ نے ان کی آنکھوں کو خیرہ اور فرنگی طرزِ حیات نے انکے پسماندہ ذہن کو بھرپور متاثر کر دیا تھا۔انکا لٹریچر، کلام، تاریخ میں موجود اخباری ریکارڈ اس بات کی بالے کھولے گواہی دے رہا ہے۔آج

بھی انکے وارثانِ فکر، مغرب سے درآمد شدہ ''جمہوریت'' کے ڈرامے میں اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ لُوٹ مار کے اس کھیل میں ان خاندانوں کے ساتھ علماء و کا ایک طبقہ اور دانشوروں اور کالم نگاروں کی ایک بہت بڑی کھیپ شامل ہے۔ ایمان فروشی کی اس تجارت میں بڑے بڑے لوگ مالدار بنتے نظر آئے، ''جمال فاقہ مستی'' کی لذت، فقرِ غیور کی حلاوت، غیرت کی سعادت کو رخصت کرنے والے یہی لوگ فرقہ واریت کا باعث ہیں اور یہی لوگ فرقہ واریت کے خاتمے کے لئے ڈھونگ رچائے ہوئے سرگرمِ عمل ہیں۔

دانش ورانِ عصر اپنی بوسیدہ دانش کا سارا زور اس بات پر خرچ کرتے ہیں کہ ''مدارس میں معاشیات، سیاسیات، لسانیات، سماجیات، بشریات، فنون وادب، شعر، بلاغت، فلسفہ، تاریخ اور کمپیوٹر جیسے مضامین کی تعلیم شامل کریں''، کبھی کیمسٹری، بیالوجی اور فزکس کا علم نہ ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ ان سر بریدہ دانش کے علمبرداروں کو خود کون سے علم میں تخصص حاصل ہوتا ہے؟ کون کون سے علم میں ان کی تحقیقات منظر عام پر ہوتی ہیں؟ ہمیں حیرت ہوتی ہے جب ایسے مانگے تانگے کی فکر والوں کی تحریریں دیکھتے ہیں تو ان کے علمی فن پارے کسی کا سرقہ ہوتے ہیں یا چربہ، صرف الفاظ کے بھاری بھرکم استعمال اور علمی اصطلاحات کے ذکر سے دبدبہ ڈالنے والے یہ ''فراڈیئے''، علم وادب اور میڈیا میں چھائے نظر آتے ہیں۔ ان کو علم ہی نہیں کہ مدارس دینیہ میں انکی بیان کردہ تعداد سے بھی زیادہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ علم وفن کی ایسی ایسی کتب ان طلباء کے زیر مطالعہ ہوتی ہیں کہ ان دانش وروں نے کبھی نام بھی نہ سُنا ہوگا۔ ان دانش وروں کی لیاقتِ علمی اتنی سی ہے کہ وہ شعر و بلاغت معانی و بیان، فلسفہ و ریاضی کی دو کُتب کے نام نہیں بتا سکتے۔ ایسے لوگ مدرسہ نصاب کی اصلاح کی باتیں کرتے ہیں تو حیرت دامن پکڑ لیتی ہے۔

مدرسوں کی کارکردگی پر سوال کرنے والوں کے لئے علامہ اقبال کا ایک گہرا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ حکیم احمد شجاع نے اپنی خودنوشت ''خُوں بہا'' میں لکھا ہے کہ ''لاہور آ کر میں نے پاکپتن شریف کے مسلمانوں کی یہ نفسیاتی کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روئیداد سر محمد اقبال کو سنائی۔ وہ پہلے تو حسب عادت میری باتیں غور سے سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ جب میں اپنی کہانی سنا چکا۔ تو فرمایا۔ ''جب میں تمہاری طرح جوان تھا۔ تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو انقلاب! ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی ہے۔ ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ مُلا اور یہ درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا۔ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیرووں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرے کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔''

○○○

محدّثِ اعظم، مولانا سید محمد محدّث، اشرفی، کچھوچھوی

یٰسٓ اختر مصباحی
دارالقلم (دہلی)

سرزمینِ کچھوچھۂ مقدسہ، شیرازِ ہند، جون پور کا وہ عظیم روحانی مرکز ہے جو، سلطانُ التّارکین، مخدوم سید، اشرف جہانگیر، سمنانی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ (وصال ۸۰۸ھ) کی نسبت سے مشہورِ انام اور مرجعِ خاص وعام ہے۔

چودھویں صدی ہجری کی معروف ومقبول دینی وروحانی شخصیت شیخُ المشائخ، حضرت سید شاہ، علی حسین، اشرفی، کچھوچھوی قُدِّسَ سِرُّہٗ ولادت: ۲۳؍ربیعُ الآخر ۱۲۶۶ھ؍دسمبر ۱۸۴۶ء۔ وصال: رجب المرجب ۱۳۵۵ھ؍۱۹۳۶ء) خانوادۂ اشرفیہ، کچھوچھہ مقدسہ کے گلِ سرسبد اور مجدّدِ سلسلۂ اشرفیہ ہیں۔ آپ کے مریدین کی تعداد، شمار سے باہر ہے۔ متعدد جلیلُ القدر عُلماے اہلِ سنّت بھی آپ کے حلقۂ بیعت وارادت میں شامل اور آپ کے دامنِ کرم سے وابستہ ہوئے۔

محدّثِ اعظم، مولانا سید محمد محدّث، اشرفی، کچھوچھوی (متوفی رجب ۱۳۸۱ھ؍دسمبر ۱۹۶۱ء) آپ کے نواسہ اور ساختہ وپرداختہ ہیں۔ مولانا محمد یعقوب حسین، ضیاءُ القادری، بدایونی (متولد ۲۶؍رجب ۱۳۰۰ھ؍۲؍جون ۱۸۸۳ء۔ بدایوں۔ متوفی ۱۲؍جمادیٰ الاخریٰ ۱۳۹۰ھ؍۱۵؍اگست ۱۹۷۰۔ کراچی) آپ کی صورت وشخصیت وخطابت کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتابی چہرہ، آیاتِ جلالی کا ترجمان۔ بڑی بڑی کشادہ آنکھیں، گنبدِ خَضرا کی تجلیات سے معمور۔ آواز میں ہیبت اور جبروت کے ساتھ، حلاوت کا انداز بھی۔

مقفع و مسجع، فصیح و بلیغ ترجمہ پڑھ کر، مجمع کو مخاطب کر رہا ہے۔ اگر، آیاتِ قرآنی کی تفسیر کی طرف، متوجہ ہوتا ہے تو، حقائق و معارف کا قلزمِ زَخَّار، دل نشیں فقرات اور ایمان افروز الفاظ میں طوفان خیز، معلوم ہوتا ہے اور اَحادیث کی شرح و وضاحت پر، مائل ہوتا ہے تو، رُشد و ہدایت کی سنہری بدلیاں، بارانِ رحمت میں مصروف، نظر آتی ہیں۔ مجمع ہے کہ وجد آفریں انداز میں جھوم رہا ہے۔ سُبْحٰنَ اللہ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْکے نعروں سے فضا، گونج رہی ہے۔ حاضرین پر، کیف، طاری ہے۔ ایمان، تازہ ہو رہا ہے اور دلوں سے سیاہی، خودبخود، دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔''

(ابتدائیہ، بقلم ضیاء القادری، بدایونی۔ در مجموعۂ نعت ''فرش پر عرش'' از محدّثِ اعظمِ ہند۔ مطبوعہ بمبئی)

محدّثِ اعظم کی تسمیہ خوانی، چار سال، چار ماہ، دس دن کی عمر میں ہوئی۔ والدہ ماجدہ سے قرآن شریف پڑھا۔ والد، مولانا حکیم سید، نذر اشرف، اشرفی، جائسی نے مروّجہ فارسی کی تعلیم دی۔ مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل، لکھنؤ میں، درس نظامی کی تحصیل و تکمیل کی۔ حضرت مولانا عبدالباری، فرنگی محلی، لکھنوی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) اور دیگر اساتذہ سے تعلیم پائی۔ یہیں، آپ، سندِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ مدرسہ، جامع مسجد، علی گڑھ میں مفتی لطف اللہ، علی گڑھی، تلمیذِ مفتی عنایت احمد، کاکوروی سے منطق و فلسفہ پڑھا۔ حضرت مولانا وصی احمد، محدّث سورتی سے پیلی بھیت میں علمِ حدیث پڑھا۔ صِحاحِ سِتّہ، مؤطّا، شرحِ معانی الآثار اور دیگر کتبِ احادیث پڑھ کر، یہاں سے علمِ حدیث کی سند پائی۔

بریلی شریف میں فقیہِ اسلام، امام احمد رضا، قادری برکاتی، بریلوی کی خدمت میں فتویٰ نویسی سیکھی۔ بدایوں جا کر، مدرسہ قادریہ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے بھی علمِ حدیث کی سند پائی۔ حضرت مولانا عبدالمقتدر، عثمانی، قادری، بدایونی سے شرفِ تلمذ پایا۔

سترہ (۱۷) سال کی عمر میں، فارغُ التحصیل ہو گئے۔ حضرت مولانا سید احمد

اشرف ، کچھوچھوی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) فرزندِ شیخُ المشائخ ،سید علی حسین، اشرفی، کچھوچھوی کے دستِ حق پرست پر، بیعت ہوئے۔ ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء میں، دہلی کے اندر ''مدرسۃُ الحدیث'' قائم فرمایا۔ ۱۳۴۱ھ/جنوری ۱۹۲۳ء میں، کچھوچھہ شریف سے ماہنامہ ''اشرفی'' جاری فرمایا۔ دارُالعلوم اشرفیہ، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ (یوپی، انڈیا) کے تاحیات، سرپرست رہے۔ مختلف سنّی تنظیموں، آل انڈیا سنّی کانفرنس، جماعتِ رضائے مصطفی، آل انڈیا سنّی جمعیۃ العُلما، وغیرہ کی سرگرمیوں میں،کلیدی کردار ادا کیا۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو مختلف سلاسل طریقت میں داخل فرما کر، ان کی روحانی تربیت کی ۔ حجازِ مقدس، عراق، فلسطین، دمشق، مصر، یمن، برما، پاکستان وغیرہ کے تبلیغی دَورے کیے۔

تصنیف وتالیف سے بھی دل چسپی رکھی۔ چھوٹی بڑی، دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ قرآنِ پاک کا سلیس ترجمہ ''معارِف القرآن'' کے نام سے لکھا۔ نعتیہ مجموعۂ کلام ''فرش پر عرش'' کے نام سے مشہور ہے۔

(ملخصاً۔ از ص ۲۶ و ص ۲۷۔ محدّثِ اعظم نمبر۔ ماہنامہ، جامِ نور۔ دہلی) شمارہ ربیعُ الآخر و جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۳۲ھ/اپریل ۲۰۱۱ء)

محدّثِ اعظم کے اساتذہ، اَجِلّۂ عُلمائے اہلِ سنّت ہیں۔ جن میں آپ کے والدِ محترم، مولانا، حکیم، سید، نذر اشرف، جائسی اور حقیقی ماموں ،حضرت مولانا سید احمد اشرف، اشرفی، کچھوچھوی کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات، زیادہ معروف ہیں:

(۱) حضرت مولانا ،عبدالباری، فرنگی محلی، لکھنوی (متوفی رجب ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء)

(۲) حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ، علی گڑھی (متوفی ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ/اکتوبر ۱۹۱۶ء۔ تلمیذِ رشید، مفتی عنایت احمد، کاکوروی۔ متوفی ۱۲۷۹ھ)

(۳) حضرت مولانا، وصی احمد، محدّث سورتی ،(متوفی چہارشنبہ، بوقتِ تہجد، بتاریخ ۸ ر جمادیٰ الاولی ۱۳۳۴ھ / ۱۶ ر اپریل ۱۹۱۶ء)

(۴) امام احمد رضا قادری برکاتی، بریلوی (متوفی ۲۵ رصفر المظفر ۱۳۴۰ھ / ۲۸ ر اکتوبر ۱۹۲۱ء)

(۵) حضرت مولانا مطیعُ الرسول، عبدالمقتدر، عثمانی، قادری، بدایونی۔ (متوفی ۲۵ رمحرمُ الحرام ۱۳۳۴ھ / ۴ ر دسمبر 1915ء۔ بحالتِ سجدہ، درنمازِ فجر)

مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل۔ لکھنؤ میں، آپ کی مدتِ تعلیم، آٹھ (۸) سال ہے۔ عُلماے فرنگی محل، بِالخصوص حضرت مولانا عبدالباری، فرنگی محلی سے آپ نے خصوصی اِستفادہ کیا۔ اور فیضانِ فرنگی محل سے، دل کھول کر، مستفیض ہوئے۔ فراغتِ تعلیم کے بعد، آپ نے، دہلی میں، مدرسۃُ الحدیث، قائم کر کے اس میں، بارہ (۱۲) سال تک، درسِ حدیث کا فریضہ، انجام دیا۔

دہلی کے بعد آپ نے، اپنے نانا جان، حضرت سید علی حسین، اشرفی، کچھوچھوی قُدِّسَ سِرُّہٗ کے قائم کردہ ادارہ ''جامعہ اشرفیہ'' کچھوچھہ شریف میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہو کر ایک عرصے تک، تعلیم دی اور تشنگانِ علوم وفنون کو، سیراب فرمایا۔

آپ سے شرفِ تلمذ رکھنے والے چند حضرات کے اسماے گرامی، درج ذیل ہیں:

حضرت مولانا محمد سلیمان، اشرفی، بھاگل پوری و حضرت مولانا سید محمد فاخر، الہ آبادی و حضرت مولانا مفتی افضلُ الدین اشرفی و حضرت مولانا سید نعیم اشرف، جائسی و حضرت مولانا سید محمد مدنی، اشرفی، کچھوچھوی۔ محدّثِ اعظم کو آپ کے ماموں اور پیر و مُرشد، حضرت مولانا سید احمد اشرف، کچھوچھوی نے ۱۳۴۰ھ میں، مواجھہ اقدس، مدینہ طیبہ میں اپنی اجازت وخلافت سے نوازا۔

شیخ المشائخ، سید شاہ علی حسین، اشرفی، کچھوچھوی کو آپ کے صاحب زادے

سید احمد اشرف، اشرفی اور نواسے، سید محمد محدّث، اشرفی کتنے عزیز تھے؟ اس کا اندازہ، آپ کے اُس تاریخی خطاب سے ہوتا ہے، جس سے، آپ نے سنّی کانفرنس، مراد آباد کی تاریخ ساز کانفرنس، منعقدہ مراد آباد، ۱۹۲۵ء کو، اِس طرح نوازا: ''مجھے، جو غم کھائے جا رہا ہے، وہ، یہ کہ میری عمر کا بڑا حصہ، گذر چکا ہے اور ضعیفی و ناتوانی نے مجھے اِس طرح گھیر لیا ہے کہ میں آپ کا ایک عضوِ معطّل ہو کر رہ گیا ہوں۔ ہاں! میری اَسّی (۸۰) برس کی کمائی میں، صرف دو چیزیں ہیں جن کی قیمت کا اندازہ، اگر آپ، میری نگاہ سے کریں گے تو، ہفت اقلیم کی تاج داری، ہیچ، نظر آئے گی۔ میری بڑی قیمتی کمائی ہے جس پر مجھ کو، دنیا میں ناز ہے اور آخرت میں بھی فخر ہوگا۔ جس کو میں، کبھی بھی، جدا نہیں کر سکتا تھا، لیکن، آج، اعلانِ حق کے لئے میں، اپنی ساری کمائی، نذر کر رہا ہوں۔ میرا اِشارہ: پہلے، اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر، مولانا ابوالمحمود، سید احمد اشرف، اشرفی، جیلانی۔ پھر، اپنے نواسہ و جگر پارہ، مولانا الحاج، ابوالحامد، سید محمد محدّث، اشرفی، جیلانی کی طرف ہے۔ ان دونوں کی ذات، میری ضعیفی کا سرمایہ ہے۔ آج، ان جگر کے ٹکڑوں کو، نذر پیش کرتا ہوں کہ: اعلانِ حق میں، آخری ساعت تک، سنّت و اہلِ سنّت کی خدمت جو، سپرد کی جائے، اُس میں میری تربیت و حقوق کا حق، ادا کریں۔'' (ماہنامہ، اشرفی، کچھوچھہ مقدسہ ضلع فیض آباد۔ شمارہ مئی ۱۹۲۵ء)

حضرت مولانا، ابوالمحمود، سید احمد اشرف، کچھوچھوی (متوفی ۱۳۴۷ھ) و محدّثِ اعظم، سید محمد محدّث، اشرفی، کچھوچھوی (متوفی ۱۳۸۱ھ) یہ دونوں ''ماموں بھانجے'' امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی سے رشتۂ تلمذ و اِستفادہ رکھنے کے ساتھ، ممتاز تلامذہ و خُلفا، آپ کے بھی ہیں۔ ماموں جان نے اپنے عزیز بھانجے کو، بارگاہِ رضوی، بریلی شریف تک پہنچا کر اپنے ساتھ اپنے بھانجے کا رشتہ بھی، اُس امامِ عشق و محبت سے اُستوار کر دیا جو، تعظیمِ رسول و تکریمِ سادات کا، اپنے عہد و عصر میں، سب سے بڑا، علَم

بَردار تھا۔ ''ایک روز، حضرت مولانا شاہ سید احمد اشرف صاحب، کچھوچھوی (بریلی) تشریف لائے ہوئے تھے۔ رخصت کے وقت، انھوں نے عرض کی کہ: مولوی سید محمد صاحب اشرفی، اپنے بھانجے کو، میں چاہتا ہوں کہ: حضور کی خدمت میں حاضر کروں۔ حضور، جو مناسب خیال فرمائیں، اُن سے کام لیں۔'' ارشاد ہوا: ضرور، تشریف لائیں۔ یہاں، فتویٰ لکھیں اور مدرسہ میں، درس دیں۔'' سید محمد اشرفی صاحب تو میرے شہزادے ہیں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ، انھیں کے جَدِّ اَمجد کا صدقہ وعطیہ ہے۔'' (ص ۵۷۔ اَلملفوظ، حصہ اول، مرتّبہ مفتیِ اعظم، مولانا الشّاہ مصطفی رضا، نوری، بریلوی)

حضرت مولانا محمد ظفر الدین، قادری، رضوی، عظیم آبادی (متوفی ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) تحریر فرماتے ہیں: مولانا سید محمد صاحب، کچھوچھوی کا بیان ہے کہ:

جب، دارُالافتا میں، کام کرنے کے سلسلے میں، میرا، بریلی شریف میں قیام تھا تو، رات دن، ایسے واقعات، سامنے آتے تھے کہ: اعلیٰ حضرت کی حاضر جوابی سے لوگ، حیران ہو جاتے۔ ان حاضر جوابیوں میں حیرت میں ڈال دینے والے واقعات وہ علمی حاضر جوابی تھی، جس کی مثال، سنی بھی نہیں گئی۔ مثلاً: اِستفتا آیا۔ دارُالافتا میں کام کرنے والوں نے پڑھا اور ایسا معلوم ہوتا کہ: نئے قسم کا حادثہ، دریافت کیا گیا۔ اور جواب، جُزئیہ کی شکل میں نہ مل سکے گا۔ فُقہا کے اصولِ عامّہ سے اِستنباط کرنا پڑے گا۔ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: عجیب، نئے نئے قسم کے سوالات آرہے ہیں۔ اب، ہم لوگ، کیا طریقہ، اختیار کریں؟

فرمایا: یہ تو، بڑا پرانا سوال ہے۔ ابنُ الھُمام نے، فتح القدیر کے فلاں صفحہ میں۔ ابنِ عابدین شامی نے، رَدُّ المحتار کی فلاں جلد اور فلاں صفحہ پر۔ فتاویٰ ہندیہ میں، خیریہ میں۔ یہ عبارت، صاف طور پر موجود ہے۔ اب جو کتابوں کو کھولا تو، صفحہ، سطر، اور بتائی ہوئی عبارت میں، ایک نقطہ کا فرق، نہیں۔ اِس خداداد فضل وکمال نے،

عُلما کو، ہمیشہ، حیرت میں رکھا۔ایک مرتبہ، پندرہ بَطن کا مناسخہ آیا۔۔۔۔۔۔۔۔یہ مناسخہ،انھیں کے سپرد کیا گیا۔مولانا سید محمد صاحب کا بیان ہے کہ:

ان کا سارادن، اسی مناسخہ کے حل کرنے میں لگ گیا۔شام کو،اعلیٰ حضرت کی عادتِ کریمہ کے مطابق، جب بعد نمازِ عصر، پھاٹک میں نشست ہوئی اور فتاویٰ، پیش کیے جانے لگے تو، میں نے بھی، اپنا قلمبند کیا ہوا جواب، اِس امید کے ساتھ، پیش کیا کہ: آج ،اعلیٰ حضرت کی دادلوں گا۔'' پہلے ،اِستفتا سنایا۔فلاں، مَرا ،اوراتنے وارث چھوڑے۔اور پھر،فلاں،مَرا،اوراتنے چھوڑے۔غرض، پندرہ (۱۵) موت، واقع ہونے کے بعد،زندوں پر،ان کے حقِ شرعی کے مطابق تَرکہ،تقسیم کرنا تھا۔ مرنے والےتو، پندرہ تھے۔مگر،زندہ وارث کی تعداد، پچاس (۵۰) سے،اوپر تھی۔

اِستفتا،ختم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا: آپ نے فلاں کواتنا،فلاں کو،اتنادیا۔

اُس وقت کا میرا حال، دنیا کی کوئی لُغت ،ظاہر،نہیں کرسکتی۔علوم اور معارف کی، یہ غیر معمولی،حاضر جوابیاں ہیں،جن کی کوئی مثال، سننے میں نہیں آئی۔''

(ص ۲۵۴ تا ص ۲۵۶۔حیاتِ اعلیٰ حضرت،حصہ اول۔رضا اکیڈمی،بمبئی)

یومِ ولادتِ امام احمد رضا کے ایک اجلاسِ ناگ پور،مہاراشٹر، منعقدہ شوال ۱۳۷۹ھ میں خطاب کرتے ہوئے،محدِّثِ اعظمِ ہند فرماتے ہیں:''تیرہویں صدی ہجری کی ،یہ واحد شخصیت تھی جو،ختمِ صدی سے پہلے،علم وفضل کا آفتابِ فضل وکمال ہوکر اسلامیات کی تبلیغ میں،عرب وعجم پر چھا گئی اور چودہویں ہجری کے شروع ،میں پورے عالَمِ اسلام میں اسے حق وصداقت کا منارۂ نور سمجھا جانے لگا۔''(ص ۳۵۔مقالاتِ یومِ رضا،جلدِ اول۔طبعِ لاہور۔مرتَّبہ: قاضی عبدالنبی کوکب)

''آج، مَیں،آپ کو، جگ بیتی نہیں، بلکہ آپ بیتی، سنارہاہوں کہ: جب،تکمیلِ درسِ نظامی و درسِ حدیث کے بعد،میرے مربِّیوں نے کارِ اِفتا کے لئے مجھے،اعلی

حضرت کے حوالے کیا، زندگی کی یہی گھڑیاں، میرے لئے سرمایۂ حیات ہوگئیں۔

اور میں، محسوس کرنے لگا کہ: آج تک جو کچھ پڑھا تھا، وہ، کچھ، نہ تھا۔ اوراب ایک دریائے علم کے ساحل کو پالیا ہے۔ علم کو، راسخ فرمانا، اور ایمان کو، رگ وپے میں اُتار دینا، اور صحیح علم دے کر نفس کا تزکیہ فرمادینا، یہ وہ کرامت تھی، جو، ہر ہر منٹ پر صادر ہوتی رہتی تھی۔'' (ص ۳۸۔ مقالاتِ یومِ رضا۔ ج:۱۔ مطبوعہ لاہور)

محدِّثِ اعظم کے خَلَفِ اکبر، شیخُ الاسلام، مولانا سید محمد مدنی، اشرفی، کچھوچھوی شہزادۂ امام احمد رضا، مولانا الشّاہ مصطفی رضا، نوری، بریلوی اور محدِّثِ اعظمِ ہند کی بصیرتِ دینی وعلمی اور روابطِ باہمی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا ممدوح (مفتیِ اعظمِ ہند، بریلوی) خلقاً وخلقاً ومنطقاً، اپنے باپ، احمد رضا، کی سچی تصویر تھا۔ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ کی ایسی بے داغ تصویر، آسانی سے دیکھنے کو نہیں ملتی۔

۔۔۔۔۔۔ ہمارے ممدوح (مفتیِ اعظمِ ہند) کی، سب سے بڑی کرامت ہرحال میں شریعت پر، اس کی اِستقامت ہے۔ وہ، اسلام کا بطلِ جلیل اور استقامت کا ایسا جبلِ عظیم تھا کہ: نازک سے نازک وقت میں بھی اُس کے پیروں میں لغزش، نہ آسکی۔ حضور مفتیِ اعظمِ ہند کے ایک فتویٰ کی تصدیق فرماتے ہوئے۔

ایک مرتبہ، مخدومُ الملّت، حضور محدِّثِ اعظمِ ہند نے صرف ایک جُملہ، تحریر فرمایا تھا:

هٰذَا حُكْمُ الْعَالِمِ الْمُطَاع وَمَاعَلَيْنَا اِلَّا الْاِتِّبَاع۔

یہ ایک عالمِ مُطاع کا حکم ہے، اور ہمارے لئے اِتّباع کے سِوا، کوئی چارۂ کار، نہیں۔''

کلام کی عظمت، متکلّم کی عظمت سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر، یہ کسی ایسے ویسے

کا کلام ہوتا تو، اس لائق نہ ہوتا کہ اس پر کسی کلام کی بنیاد رکھی جائے۔ مگر، یہ اُس کا کلام ہے جو، صرف، یہی نہیں کہ سید المتکلمین، سند المحققین، سر آمدِ عُلما وصوفیہ، سراجِ خانوادۂ اشرفیہ تھا، بلکہ خود، حضور مفتیِ اعظمِ ہند کی بے پناہ عقیدت ومحبت اور لازوال نیاز مندیوں کا قبلہ وکعبہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ آج تک، مفتیِ اعظمِ ہند کا تعارف کراتے ہوئے جو، کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھا جائے گا، اُن سب کو ایک پلڑے پر اور حضور محدّثِ اعظم کے قلم سے نکلے ہوئے اِس فقرے کو، دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو، اس کا وزن، زیادہ ہوگا۔ ہم، اُس عظیم فرزند کے فضل وکمال کا کیا تعارف کرا سکیں گے جسے، حضور محدّثِ اعظم جیسی شخصیت بھی ''عالمِ مُطاع واجبُ الاتّباع۔'' قرار دے۔'' (ص ۲۳۱۔''جہانِ مفتیِ اعظم''، رضا اکیڈمی۔ بمبئی۔ ومفتیِ اعظم نمبر۔ ماہنامہ استقامت، کان پور۔ شمارہ مئی ۱۹۸۳ء) اِسی طرح، حضرت محدّثِ اعظم اور صدرُ الشریعہ، مولانا محمد امجد علی، اعظمی، رضوی کے مخلصانہ رَوابط وتعلقاتِ باہمی کے بارے میں، شارحِ بخاری، مفتی محمد شریف الحق امجدی (سابق صدر شعبۂ اِفتا الجامعۃ الاشرفیہ۔ مبارک پور۔ متوفی ۲۰۰۰ء) بطورِ عینی مشاہدہ، تحریر فرماتے ہیں:

''اشرفیہ، مبارک پور کے سالانہ جلسے میں ابتدا ہی سے حضرت صدرُ الشریعہ اور حضرت محدّثِ اعظم، ضرور، شریک ہوتے تھے، اِس لئے کہ، یہ دونوں حضرات، اشرفیہ کے سرپرست تھے۔

ایک دفعہ، ایسا ہوا کہ حضرت محدّثِ اعظمِ ہند، شام کو ساڑھے پانچ بجے، تشریف لائے۔ اور کہیں، بہت دور سے آرہے تھے، اِس لئے تھکے ہوئے تھے۔

بعد نمازِ عشا، کھانے کے دسترخوان پر، حضرت صدرُ الشریعہ سے فرمایا:

حضرت! مَیں، بہت، تھکا ماندہ ہوں۔ تقریر، نہیں کرسکتا۔ آج، آپ، بھرپور تقریر فرمائیں۔'' حضرت صدرُ الشریعہ نے فرمایا کہ: مجھے، تقریر کرنی، نہیں

آتی۔ یہاں کے لوگ آپ کی تقریر سننے کے مشتاق ہیں۔ آپ، خطیب ہیں۔ مَیں، تھوڑی دیر، بیان کردوں گا۔ پھر، آپ کو تقریر کرنی ہوگی۔''

حضرت محدِّثِ اعظم نے اپنی تھکن کا، عُذر، دُہرایا۔ اور ارشاد فرمایا:

حضرت! دل کھول کر، تقریر فرمادیں۔ پھر، کسی کو ہوش ہی، نہیں رہے گا کہ میرا نام لے۔'' حضرت صدرُ الشریعہ نے فرمایا کہ: دیکھا جائے گا۔'' جلسہ کے وقت، حضرت محدِّثِ اعظم نے فرمایا کہ: مَیں، اگرچہ، بہت تھکا ہوا ہوں۔ سونے کے لئے مضطرب ہوں۔ مگر، جلسے میں، ضرور چلوں گا۔ آج، صدرُ الشریعہ کی تقریر سُننی ہے۔''

دونوں اکابر، ساتھ ساتھ، جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ اور دو کرسیاں، رکھ دی گئیں۔ اور پھر، صدرُ الشریعہ نے تقریر، شروع فرمائی۔ صدرُ الشریعہ نے، خطبہ وتمہید کے بعد فرمایا: اللہ عَزَّ وَجَلَّ ارشاد فرماتا ہے:

قُلْ لَوْكَانَ الْبَحْرُمِدَاداً لِكَلِمٰتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُقَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّي وَلَوْجِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَداً۔

حضرت شیخ عبدالحق، محدِّث دہلوی، عَلَیْہِ الرَّحْمَۃُ وَالرِّضْوَان نے فرمایا کہ:

''**كَلِمٰتُ رَبِّي**'' سے مراد، حضور اقدس **صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم** کی مدح وثنا ہے۔ (صدرُ الشریعہ نمبر۔ ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور۔ وص ۹۳۔ مقالاتِ شارحِ بخاری)

واقعہ کا تسلسل، برقرار رکھتے ہوئے، شارحِ بخاری، عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ، فرماتے ہیں:

''مجھے، وہ منظر، اچھی طرح، ذہن نشین ہے۔ اِس کے بعد، حضرت صدرُ الشریعہ نے، دو گھنٹے، تقریر فرمائی اور خود، حضرت محدِّثِ اعظم، اِس محویت سے سن رہے تھے کہ: کرسی پر پہلو بھی، نہ بدلا اور ٹکٹکی باندھے، حضرت صدرُ الشریعہ کو دیکھتے رہے۔

اُس وقت، نہ واہ واہ کا، رواج تھا، نہ سُبْحٰنَ اللہ، سُبْحٰنَ اللہ کہنے کا۔

اور نہ، نعرۂ تکبیر ورسالت کا۔ وقار واطمینان کے ساتھ، لوگ، عُلما کی تقریر سنتے

تھے۔ پھر بھی، محدّثِ اعظمِ ہند، بار بار، ہلکی آواز میں سُبْحٰنَ اللہ، سُبْحٰنَ اللہ کہتے جاتے تھے۔ اگر چہ، ان کی ہلکی آواز، پورے مجمع میں گونج جاتی تھی۔

۔۔۔۔۔ دوسرے دن، حضرت محدّثِ اعظمِ ہند نے، اسی آیتِ کریمہ:

قُلْ لَوْكَانَ الْبَحْرُمِدَاداً لِكَلِمٰتِ رَبِّيكو، اپنی تقریر کا عنوان بنایا۔

اِس نکتہ کو لے کر کہ، حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی مدح وثنا "**کَلِمٰتُ رَبِّی**" کیسے ہے؟ دو گھنٹے، انتہائی پُر مغز، دل آویز، ایمان افروز اور پورے خطیبانہ آن بان کے ساتھ تقریر فرمائی۔ جس کی لذت سے، آج بھی، روح، سرشار ہے۔ حضرت محدّثِ اعظم نے، اس شرابِ علم کو، دوآتشہ بنا کر پورے مجمع کو، مست و بے خود بنا دیا۔ (صدرُ الشریعہ نمبر۔ ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور۔ وص ۹۴۔ مقالاتِ شارح بخاری)

علاّمہ عبدالمصطفیٰ، اعظمی عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ نے، اپنی چند یادداشتیں، قلمبند کی ہیں۔ جن میں آپ لکھتے ہیں:

''ایک بار، دارُ العلوم اشرفیہ کے نظامِ تعلیم و تعلُّم کے بارے میں (حضرت محدّثِ اعظمِ ہند) مجھ سے، اِستفسار فرما رہے تھے۔ اِسی ضمن میں، دریافت فرمایا کہ:

دیوانِ متنبی کا سبق، کس مدرس کے پاس ہے؟

میں نے عرض کیا: خادم ہی کے پاس ہے۔

فرمایا: کہاں تک ہو چکی ہے؟

میں نے عرض کیا: ردیف با، قریبُ الختم ہے۔

فرمایا: واہ! ابھی تک، گویا، آپ، متنبی کے الف ب تک پہنچے ہیں۔

اچھا، یہ تو بتایئے کہ دیوانِ متنبی میں، نعت کا کون سا شعر، آپ کو پسند آیا؟

میں نے عرض کیا: حضور! دیوانِ متنبی میں نعت کے شعر تو نہیں ہیں۔

گرج دار آواز میں فرمایا: کیوں نہیں ہیں؟ متنبی نے تو، حضور عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ

وَالسَّلام کا نام لے کر نعت کہی ہے اورایک شعرتو،ایسا کہہ گیاہے کہ عربی ، فارسی،اردوکسی زبان میں بھی اس مضمون پر،اتنابلند پایہ شعر،آج تک،میری نظر سے، نہیں گذراہے۔میں،سراپااِستعجاب بن کر،حضرت عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ کا،مُنہ تک رہاتھا کہ:

بَھلا،دیوانِ متنبی میں،نعت کا کون ساشعر ہے۔اوروہ بھی،عدیم المثال؟

پھر،ایک دَم آپ نے فرمایا:اچھابتایئے؟یہ شعرکس کا ہے؟

اَلا اِنَّمَا کَانَتْ وَفَاۃُ مُحَمَّدٍ

دَلِیْلاً عَلیٰ اَنْ لَیْسَ لِلّٰہِ غَالب

ترجمہ:خبردار!محمدکی وفات، اِس بات پر،دلیل ہوگئی کہ خداکے لئے کوئی، غالب،نہیں ہے۔''

میں نےعرض کیا:حضور!یہ متنبی کاشعرہے،جو،اس نے محمد بن التنوخی کی مدح میں کہاہے۔تبسم فرماتے ہوئے ارشادفرمایا:متنبی نے ،اس کو،محمدتنوخی کے لئے کہا ہوگا مگر،ہم تو،اس شعرکو،محمدعربی کے لئے پڑھتے ہیں۔

(صَلَّیاللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)

کہیے۔نعت کا کتنابلند پایہ شعرہے؟

واہ واہ!درحقیقت، اِس شعرکو،نعت میں پڑھنے کے بعدمجھ پربھی ،ایسی کیفیت ،طاری ہوئی کہ میں ،سردُھننے لگا۔عرسِ مسعودی، بہرائچ شریف کے جلسوں میں حضرت محدِّثِ اعظم عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ ،راقم الحروف (عبدالمصطفیٰ، اعظمی) اورمولانا عبدالحامد ،بدایونی ومولوی شاہد،فاخری(الٰہ آبادی) چندعُلما،مدعو تھے۔آخرالذکر دونوں صاحبان نے مہمان خانہ مسعودیہ میں قیام کیا۔مگر،حضرت عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ اپنے مُرید،سیٹھ ننھے میاں،تاجرکی کوٹھی پرتشریف فرماتھے۔

مجھے،حضرت عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ کی فرقت، گوارانہیں تھی۔ اِس لئے میں، درگاہ شریف

سے ننھے میاں کی کوٹھی پر پہنچا۔ کوٹھی، مہمانوں سے پُر تھی۔ حضرت عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ نے فرمایا کہ: آپ، مہمان خانہ مسعودیہ میں، کیوں نہیں ٹھہرے؟ میں نے عرض کیا کہ بَھلا، مَیں، حضور والا کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ پھر، میں نے عرض کیا کہ: حضورِ والا نے مہمان خانہ مسعودیہ میں کیوں نہیں قیام فرمایا؟ وہاں سے شرکتِ اجلاس میں بڑی سہولت رہتی۔ مولانا عبدالحامد صاحب (بدایونی) اور مولوی شاہد فاخری صاحب (الٰہ آبادی) وہیں، مقیم ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ: سُبْحٰنَ اللہ! آپ، خود، تو، وہاں، ٹھہرے نہیں۔ مگر، بنی امیہ اور بنی ہاشم کو ایک ہی منزل میں، دیکھنا چاہتے ہیں؟ وہاں، کانگریس اور مسلم لیگ کا ملاپ تو، ہو ہی چکا ہے۔ کیا، آپ، چاہتے ہیں کہ سنّی کانفرنس بھی، ان دونوں کے ساتھ، مدغم ہو جائے؟ (مولانا عبدالحامد بدایونی، نَسباً، عثمانی اموی اور کٹّر مسلم لیگی اور مولوی شاہد فاخری پکّے کانگریسی ہیں۔ اور حضرت محدّثِ اعظم عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ ہاشمی اور سنّی کانفرنس کے صدر۔ اِن حقائق کی طرف، کتنے لطیف انداز میں اشارہ فرمایا ہے) میرے قیامِ احمد آباد (گجرات) کے زمانے میں، میرے بعض حاسد مولویوں کی دَسیسہ کاریوں کی وجہ سے میرے اور حضرت محدّثِ اعظم عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ کے درمیان قدرے شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ، میں، حج کی روانگی کے وقت ایک معافی نامہ، تحریر کر کے حضرت عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ سے، دعاؤں کا خواستگار رہا۔

اس کے جواب میں، مندرجہ ذیل مضمون کا گرامی نامہ، میرے نام، عزت بخش ہوا۔

مولانا الْاَعَزّ! سَلَّمَکُمُ اللہ تَعَالیٰ

محبت نامہ، نظر نواز ہوا۔ حج و زیارت کی خبر نے، مَسرورُ الوقت کیا۔ میرا، ہر بُنِ مو، آپ کے لئے مصروفِ دعا ہے۔ اِس موقع پر، یہاں تو، آپ نے، مجھے، یاد رکھا کاش! حرمین طیبین میں بھی آپ، یاد رکھ کر مجھے اور زیادہ مسرور کرتے۔ جس

وقت، میرادعا نامہ آپ کو ملے گا، میں، اُس وقت بنگال کی سرحد میں داخل ہو چکا ہوں گا۔ اِس لئے ملاقات نہیں ہوسکتی۔

فقط وَالدُّعا۔ دعا گو۔ فقیر، ابوالمحامد سید محمد اشرفی جیلانی غُفِرَ لَہٗ۔

حرمین طیبین سے واپسی پر پہلی ملاقات، مدرسہ احسن المدارس، کان پور کے اجلاس میں ہوئی۔ حضرت محدِّث ِاعظم عَلَیۡہِ الرَّحۡمَۃ نے جس اِلتفات اورگرم جوشی کے ساتھ معانقہ فرمایا، اُس کی لذت، آج تک، فراموش نہیں کرسکا ہوں۔''

(ص ۷۴ تا ص ۹ ۴۔ محدِّث ِاعظمِ ہند: کچھ یادیں کچھ باتیں۔ بقلم علاَّمہ عبدالمصطفیٰ، اعظمی۔

محدِّث ِاعظم نمبر۔ ماہنامہ جامِ نور۔ دہلی۔ شمارہ ربیع الآخر و جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۳۲ھ/ اپریل ۲۰۱۱ء)

سوامی، شردھانند، وغیرہ کی، شدھی تحریک (تحریکِ اِرتدادِ مسلمین) ۱۹۲۳ء کے جواب ودفاع میں جاری کوششوں اوراہلِ اسلام کی قربانیوں کومحدِّث ِاعظم نے صرف قریب سے دیکھا نہیں، بلکہ عملی طور پر بھی آگرہ کے مرکزی محاذ تک پہنچے۔ چنانچہ، اِس سلسلے میں آپ لکھتے ہیں:

''مؤرخہ ۲۳/ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق اگست ۱۹۲۳ء کو، میں، طلبیدہ، فرنگی محل، لکھنؤ گیا

اوروہاں سے آگرہ، روانہ ہوا۔ تاکہ مُبلغینِ اسلام کی مساعیِ جمیلہ کا مشاہدہ کروں۔'' (ماہنامہ اشرفی، کچھوچھہ ضلع فیض آباد۔ ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ/ اگست ۱۹۲۳ء)

عیدگاہ بھڑوچ، گجرات کی ایک کانفرنس منعقدہ ۱۸/تا ۲۰/نومبر ۱۹۵۷ء کے خطبۂ صدارت میں آپ، فرماتے ہیں:

''مگر، مَلکانہ کا، ذرہ ذرہ گواہ ہے۔ اوراُس وقت کے حکومتی دفاتر، گواہ ہیں کہ:

''جماعتِ رضائے مصطفیٰ (بریلی) نے، تحریک (شدھی) کو، ایسی فاش شکست دی کہ جو، بچھڑ چکے تھے، آ کے گلے ملے اور جو، بچھڑنے کے قریب تھے، وہ بچے رہے

اوراس سَعی کے نتیجے میں، جو، قطعی بیگانے تھے، ان کی بڑی تعداد کے افراد، اپنے یگانے ہوگئے۔ (ماہنامہ ''سنّی''، لکھنؤ۔ شمارہ ماہ جمادیٰ الآخرہ ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء)

اپنے ایک گراں قدر مضمون میں، محدّثِ اعظمِ ہند، تحریر فرماتے ہیں:

مجھے، ان ایامِ جنگ میں، جماعت (رضائے مصطفی، بریلی) کے جنگی دفتر (محلہ رکاب گنج۔ آگرہ) میں حاضری کا شرف، حاصل ہو چکا ہے، ۔۔۔۔۔۔ہم، ممبرانِ جماعت (رضائے مصطفی) سے، واقفیت رکھتے ہیں اوران کے عیش وآرام کا، بار بار، مشاہدہ کیا ہے۔ اب، ان کو، مَلکانہ میں، وسیع دسترخوان کی جگہ۔ کسی درخت کے نیچے۔ فرشِ زمین پر بیٹھا کئی وقتوں کے بعد، چنے چباتے بھی دیکھتے ہیں، تو، ہماری آنکھوں سے آنسو کی جگہ، خون ٹپک پڑتا ہے۔ مسلمانو! صرف، دودن بھوکے پیاسے رہو۔ اور پھر، سوچو کہ: اسلامی فوج، تقریباً، دو برس تک، بھوکی پیاسی، لڑی اور بتاؤ کہ تم لشکرِ اسلام کا، اِس سے زیادہ، کیا، امتحان لینا چاہتے ہو؟

(ص ۲۲ تا ۳۴۔ روداد ''جماعتِ رضائے مصطفی''، بریلی، ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء)

اپنی آواز، اپنا پیغام، اپنا خیال، اپنی فکر، اپنی تحقیق، دوسروں تک پہنچانے کے لئے محدّثِ اعظم نے، زبان کے ساتھ، قلم کا بھی سہارا لیا اور ہمہ وقت، مصروف رہنے کے باوجود، آپ کی متعدد تحریری خدمات، آپ کی دینی و علمی یادگار ہیں۔ جن میں، سرِفہرست آپ کا ترجمۂ قرآن، بنام ''معارفُ القرآن'' ہے۔ جس کے اردو و ہندی و گجراتی ایڈیشن ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء میں ایک ساتھ، منظرِ عام پر آئے۔ معارف القرآن کی تکمیل ۱۳۶۶ھ میں ہوگئی تھی، جس کے بعد تفسیرِ قرآن کا بھی کام شروع ہوگیا تھا۔ مگر، اس کا سلسلہ، تین پاروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ترجمہ و تفسیر کے علاوہ، آپ کی کتب و رسائل کے نام، یہ ہیں:

(۱) خدا کی رحمت: مجموعۂ عقائدِ اہلِ سنّت۔ مطبوعہ ۱۹۲۴ء۔

(۲) فرش پر عرش:۔ مجموعۂ نعت ومنقبت۔ طبعِ اول ۱۹۵۵ء۔

(۳) **تَحْقِيْقُ الْبَارِعِ فِى حُقُوْقِ الشَّارِعْ** مطبوعہ ۱۳۵۷ھ انجمن اہلِ سنّت، جون پور۔

(۴) تقویٰ القلوب: جوابِ اِستفتا از سید غلام بھیک، نیرنگؔ۔ مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔

تقویٰ القلوب کی زیروکس کاپی، حضرت مولانا سید محمد جیلانی، اشرفی، کچھوچھوی جب، ماہنامہ اُلمیزان، دہلی سے نکال رہے تھے، اُس وقت، انہوں نے اِس حکم کے ساتھ، مجھے عنایت فرمایا کہ اس پر آپ، ایک علمی و تحقیقی مضمون، تحریر کریں۔ چنانچہ، تعمیلِ حکم میں ایک تفصیلی و تحقیقی مضمون، میں نے سپردِ قلم کیا جسے آپ نے اپنے ماہنامہ اُلمیزان میں ''محدّثِ اعظم / محققِ اعظم'' کے عنوان سے شائع کیا۔

(۵) **بَصَارَةُ الْعَيْن فِى اَنَّ وَقتَ الْعَصْرِ بَعدَ الْمِثْلَين** ۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۳۲۶ھ۔

(۶) **اَلْاِجَازَة بِالدُّعَائِ بَعدَ صَلٰوةِ الْجَنَازَة**:۔ مطبوعہ ۱۹۳۶ء۔

(۷) **اَحْسَنُ التَّحْقِيقات فى جَوَازِ الدُّعائِ لِلْاَمْوَات** ۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۳۳۷ھ۔

(۸) تحقیق التقلید:۔ مطبوعہ ۱۳۴۴ھ۔

(۹) اِتمامِ حجت، برجندِ منکرِ نبوت:۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء۔

(۱۰) مرقاتِ بے مثال:۔ مطبوعہ ۱۳۳۶ھ۔

(۱۱) قہرِ قہّار، برروئے نابنجار:۔ مولوی غنیمت حسین، مونگیری کے دس سوالوں کے جوابات۔ مطبوعہ ۱۳۳۹ھ۔

(۱۲) **قَالَ اَقُول فِى رَدِّ اَہلِ الضَّلال وَالْمَجْہُول** ۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۶ء۔

(۱۳) نوکِ تیر:۔ ایک گمراہ کن اِشتہار کا دنداں شکن جواب:۔ مطبوعہ

۱۳۲۴ھ۔

(۱۴) رودادِ مناظرۂ کچھو چھہ شریف:۔ مکمل روداد۔ مطبوعہ

(۱۵) حیاتِ غوثُ العالَم:۔ حضرت مخدوم سمنانی (وصال ۸۰۸ھ) کی سیرت وسوانح۔ مطبوعہ کچھو چھہ مقدسہ ۱۹۲۴ء۔

آخری ایامِ حیات میں، جب کہ آپ لکھنؤ میں زیر علاج تھے۔ ۱۶/رجب ۱۳۸۱ھ/ ۲۵/دسمبر ۱۹۶۱ء بروز دوشنبہ بوقت ساڑھے بارہ بجے دن آپ نے، اللہ اللہ کی تسبیح کے ساتھ، زندگی کی آخری سانس لی اور موٹر لاری کے ذریعہ، آپ کو لکھنؤ سے کچھو چھہ شریف لے جایا گیا اور ۲۶/دسمبر کو چار بجے شام کو، سرکارِ کلاں، حضرت مولانا سید مختار اشرف، کچھوچھوی (وصال ۱۹۹۶ء) نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور کچھو چھہ شریف میں آپ کی تدفین ہوئی۔ معارف القرآن، از محدّثِ اعظمِ ہند کے تعارف پر مشتمل ، ایک مضمون میں حضرت پروفیسر، محمد مسعود احمد، مجدّ دی، مظہری، دہلوی (کراچی) تحریر فرماتے ہیں:

''راقم نے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان، حضرت مولانا سید محمد محدّثِ کچھوچھوی کی کئی بار، زیارت کی ہے۔ عوامی جلسوں میں، نجی محفلوں اور دعوتوں میں دہلی اور بھاول پور (پنجاب) میں، کئی بار، زیارت ہوئی ہے۔

حضرت سید محمدمحدّث، کچھوچھوی عَلَیْهِ الرَّحْمَة کو، راقم (محمد مسعود احمد) کے والد ماجد مفتیِ اعظم، شاہ محمد مظہر اللہ، دہلوی عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ (وصال ۱۹۶۶ء) اور راقم کے بہنوئی پیرِ طریقت، عاشقِ رسول، حضرت قاری سید محمد حفیظ الرحمن عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ سے خاص محبت تھی۔ اِس وقت، حضرت محدّثِ اعظم، کچھوچھوی کا سراپا، سامنے ہے۔

آیئے! ماضی کے جھروکے سے، ان کی زیارت کریں:

خاندانی جاہ وجلال، بادشاہوں کی اولاد، مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (وصال ۸۰۸ھ) کے چشم و چراغ، بلند و بالا قامت، گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، بھرواں داڑھی سر پر تاج نُما کلاہِ سمنانی، تن بدن پر عبا اور قبا، ہاتھ میں عصائے دراز زَرنگار مستانہ چال، جھوم کر چلتے ہوئے، جب جلسہ گاہ میں تشریف لاتے تو، ایسا معلوم ہوتا کہ شیر، کچھار سے نکل رہا ہو۔ بھیڑ چھٹتی چلی جاتی اور وہ، آگے، بڑھتے چلے جاتے۔ آواز، ایسی جیسے ہاتفِ غیبی، عالَمِ بالا سے بول رہا ہو۔ گفتگو کا ٹھہراؤ، تقریر کا رَچاؤ باتوں کی گھن گرج اور گونج، جیسے بادل، گرج رہا ہو۔ جیسے بجلی، کڑک رہی ہو۔ جیسے مینہ، برس رہا ہو۔ دور سے دیکھیے تو، رعب و دبدبہ سے دیکھا نہ جائے۔ پاس بیٹھیے تو، باتوں سے پھول جھڑیں محبانِ رسول کے لئے شبنم کی ٹھنڈک، گستاخانِ رسول کے لئے نشتر کی چبھن۔ تقریر میں قرآنی اَسرار و معارف کا دریا بہاتے ۔ لوگ، سن سن کر، حیران و ششدر رہ جاتے۔ تقریر سے پہلے، اپنے خاص انداز میں عربی خطبہ، ارشاد فرماتے۔ ٹھہر ٹھہر کر، آہستہ آہستہ نعتِ منثور کا سماں، بندھ جاتا ۔ دل، کھنچنے لگتے۔ روح پر، کیف و سرور کا عالَم، طاری ہوجاتا۔ پھر، تلاوت فرماتے۔ تقریر فرماتے ۔ دھیرے دھیرے، آگے بڑھتے۔ یہاں تک کہ تقریر سے علم و دانش کے فوارے پھوٹنے لگتے۔ جب، وہ، تقریر کرتے محفل پر، سنّاٹا چھاجاتا۔ کوئی باتیں کرتا، نظر نہیں آتا۔ سبھی، ان کو، ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے۔ گستاخانِ رسول پر، ہیبت، طاری ہوجاتی ۔ بِلاشبہ، حضرت سید محمد محدّث، کچھوچھوی عَلَیہِ الرَّحمَۃ صوری و معنوی جمال وجلال کا حسین پیکر تھے۔ پھر، ان جیسا، نہ پایا۔ پھر، ان جیسا، نہ دیکھا۔

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

(محدّثِ اعظم نمبر۔ ماہنامہ، جامِ نور۔ نئی دہلی۔ اپریل ۲۰۱۱ء)

شیخُ الاسلام، سیدمحمد مدنی میاں، اشرفی ، کچھوچھوی، سَوَادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے جلیلُ القدر عالمِ دین اور اپنے والدِ ماجد، حضرت محدّثِ اعظمِ ہند کے، جانشین ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ، انھیں، صحت وسلامتی کے ساتھ اِس عظیم خدمت کی تکمیل کی توفیق، عطافرمائے۔ آمین یَا رَبَّ الْعَالَمِیْن۔

بِجَاہِ حَبِیْبِکَ سَیِّدِالْمُرْسَلِین عَلَیْہِ وَعَلیٰ آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ الصَّلٰوۃُ وَالتَّسْلِیم۔

○○○

مولانا ذیشان احمد مصباحی کی کتاب مسئلہ تکفیر و متکلمین پر تعلیقات اور نقد و تبصرہ

کلام مبین علی مسئلہ تکفیر و متکلمین

مولانا محمد رضوان طاہر فریدی

کتاب مسئلہ تکفیر و متکلمین کے صفحہ ۶ پر علامہ نور الدین عبد الرحمن جامی کے کچھ فارسی اشعار درج ہیں جبکہ صفحہ ۷ پر ان کا ترجمہ دیا گیا ہے جسے ہم تین حصوں میں نقل کر کے اس پر اپنی تعلیقات سپرد قلم کرتے ہیں۔

مولانا ذیشان احمد مصباحی کا کتاب میں منہج رہا ہے کہ وہ اہم اور ضروری مقامات پر حواشی بھی لکھتے جاتے ہیں تاکہ کوئی بھی بحث ان کی طرف سے نامکمل نہ رہے اور ان کا موقف ہر جگہ کھل کر واضح ہو جائے مگر یہاں انہوں نے کسی طرح کا حاشیہ دینا پسند نہیں کیا جس سے یہی سمجھا جائے گا کہ یہ ان کا ذاتی مؤقف ہے اگرچہ کلام علامہ جامی علیہ الرحمہ کا ہے اس جہت سے ہماری یہ تعلیقات مولانا مصباحی کے کلام پر ہوگی نا کہ علامہ جامی کے۔

1۔تعلیمات محمدی کا شیدائی:

جو بھی تمہاری نظر میں اہل قبلہ ہو اور تعلیمات محمدی کا شیدائی ہو اگرچہ علم و عمل کے لحاظ سے اس کے اندر سیکڑوں بدعات و خرافات اور نقص و کمی پاؤ، پھر بھی قطعی اس کی تکفیر مت کرو، نہ اسے جہنمی اور دوزخی سمجھو۔ (مسئلہ تکفیر و متکلمین، صفحہ ۷)

اسلوب کلام:

اقول۔ اول تو اس کلام کے اسلوب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علماء کسی کی تکفیر اپنی مرضی سے کرتے ہیں یعنی کسی شخص کے اندر کوئی خرافات دیکھی یا وہ کسی بدعت کا مرتکب ہوا تو اس کی تکفیر کر دی گئی۔ ایسا ہی کچھ آزاد خیال، لبرل اور سیکولر افراد کا کہنا

ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے علماء کرام کسی کی تکفیر اپنی خواہش سے نہیں کرتے کیونکہ علماء کا منصب مخبر عن الحکم کا ہے وہ صرف کسی کو اس پر وارد ہونے والے حکم شرعی سے آگاہ کرتے ہیں یعنی کوئی شخص اپنے افعال و کردار سے کسی جرم کا مرتکب ہو کر دائرۂ تکفیر میں خود داخل ہو جاتا ہے اور عالم دین فقط اسے اطلاع دیتا ہے کہ آپ فلاں حد میں داخل ہو چکے ہیں یعنی اسلام کے Red zone کو کراس کر چکے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کمرے یا دائرہ سے باہر نکل جاتا ہے اور عالم دین اسے اطلاع دیتا ہے کہ آپ اس کمرے یا دائرہ سے باہر جا چکے ہیں سلامتی اسی میں ہے کہ واپس تشریف لے آئے اب نہ تو عالم نے اسے کمرے یا دائرہ سے زبردستی نکالا ہے اور نہ ہی اس کے نکلنے میں کوئی کردار ادا کیا ہے بلکہ وہ خود نکلا ہے عالم نے تو اس کے نکل جانے کی اسے صرف اطلاع دی ہے۔

اہل قبلہ ہونا نفع نہ دے گا:

دوم یہ بات درست ہے کہ کسی شخص کی اس کے فسق کی بناء پر تکفیر نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اہلسنت میں سے ہم کسی فقہیہ کو جانتے ہیں جو کسی شخص کی اس کے فسق و بدعت کی وجہ سے تکفیر کرتا ہو۔ نیز ضروریات دینی میں سے کسی کا منکر اس کلام سے خارج ہے جیسے منکر زکوۃ یا منکر حج وغیرہ کہ اب اس کا اہل قبلہ ہونا یا تعلیمات محمدی کا شیدائی ہونا اسے نفع نہ دے گا۔

محدث ملا علی بن سلطان محمد قاری لکھتے ہیں

''من استحل معصیۃ قد ثبتت حرمتھا بدلیل قطعی فھو کافر'' جو شخص ایسے گناہ کو حلال سمجھے جس کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہو وہ کافر ہے۔

(منح الروض الازھر، صفحہ ۱۲۷)

علامہ سعد الدین تفتازانی فرماتے ہیں

''صغيرة كانت أو كبيرة''

معصیت صغیرہ ہو یا کبیرہ۔(حکم ایک ہی ہے۔)

(شرح العقائد النسفیہ ،صفحہ ۳۵۰)

اسلام کا احتمال ہو تو تکفیر نہیں کی جائے گی:

سوم۔ ہمارے اکابر نے اس سے بھی عمدہ بات کہی ہے چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں '' لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن، أو كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة''، کسی مسلمان کے کفر کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا اگر اس کے کلام کی بہتر تاویل ممکن ہو یا اس کے کفر میں اختلاف ہو اگرچہ اختلاف ضعیف روایت سے مروی ہو۔

(ردالمحتار، الجزالسادس کتاب الجہاد، باب المرتد، صفحہ ۳۵۸)

بلکہ یہ جزیہ تو کتب میں بڑا عام پایا جاتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں ۹۹، احتمالات کفر کے ہوں اور ایک احتمال اسلام کا ہو تو اس کو اسلام پر محمول کیا جائے گا مسلمان کے ساتھ حسن ظن کی بناء پر۔

2۔ کسی کو قطعی جنتی مت سمجھو:

اسی طرح جسے تم صبح و شام متقی اور دین دار پاؤ، منہیات شرعی سے کلیتہ گریزاں اور اوامر دین کا پابند دیکھو، جو فرائض و نوافل کے ذریعہ سفر آخرت کی تیاری کرتا ہوا نظر آئے، پھر بھی اسے قطعی و یقینی جنتی مت سمجھو اور عذاب آخرت سے بے خوف مت جانو۔(مسئلہ تکفیر و متکلمین، صفحہ ۷)

اعمال کا دارومدار:

اقول۔ ایسا اس لیے کہ ایک روایت میں ہے اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے لیکن ایک مسلمان کے ساتھ ایسا اعتقاد رکھنا فرض و واجب نہیں ہے بلکہ اس کے متعلق حسن ظن ہی رکھا جائے گا اور

اس کے متعلق اللہ سے خیر کی توقع کی جاے گی کہ جس پروردگار نے ایمان کی دولت عطا فرما کر اعمال صالحہ کی توفیق بخشی وہ اپنے بے پایہ کرم سے حسن خاتمہ اور جنت کی نعمت سے بھی نوازے گا نیز شریعت ظاہر پر لاگو ہوتی ہے اسی وجہ سے ایک مسلمان کتنا ہی گنہگار، خرافات کا پیکر اور فسق و فجور میں ڈوبا ہوا ہو اس کے مرنے کے بعد اس پر شریعت کے احکام ہی جاری ہوتے ہیں اور اس پر وہ تمام لوازمات جاری ہوتے ہیں جو ایک نیک مسلمان پر جاری ہوتے ہیں۔ جب کسی مسلمان کی زندگی نیک اعمال میں گزری اور اسی پر اس کا خاتمہ ہوا تو ہم اس کے اعمال کو دیکھتے ہوئے اسے جنتی ہی کہیں گے کہ

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

البتہ ہر مسلمان کو اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ جنت میں داخلہ اعمال صالحہ کی بناء پر نہیں بلکہ محض فضل خداوندی سے ہو گا رسول اکرم، نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''میانہ روی اختیار کرو اور سیدھے راستے پر رہو اور اس بات کا یقین رکھو کہ تم میں سے کسی ایک کا بھی عمل اسے نجات نہیں دے گا (نجات فقط اللہ کی رحمت سے ہو گی) لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو بھی نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے بھی نہیں البتہ اللہ تعالی مجھے اپنی رحمت اور فضل میں ڈھانپ لے گا۔

(الجامع الصحیح للمسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب لن یدخل أحد الجنۃ بعملہ، رقم الحدیث ۷۱۱۷)

3۔ جنت الماوی کی بشارت:

سوائے ان کے جنہیں پیغمبر دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنت الماوی کی بشارت حاصل ہے۔ اگر چہ اس حوالے سے صرف دس نفوس قدسیہ مشہور ہیں تاہم انہیں صرف دس میں ہی منحصر مت جانو، کیونکہ اہل بیت کرام میں ایک گروہ کو بھی یہ بشارت حاصل ہے۔ (مسئلہ تکفیر و متکلمین، صفحہ ۷)

مولانا مصباحی پر افسوس:

اقول۔مولانا مصباحی پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے کہ موصوف الجامعۃ الاشرفیہ کے جید علماء سے شرف تلمذ رکھنے کے باوجود صحابہ کرام علیھم الرضوان میں سے صرف عشرہ مبشرہ اور اہل بیت اطہار میں سے بعض کے علاوہ کسی کے بھی قطعی ویقینی جنتی ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو حاشیہ میں صراحت ضرور کرتے۔

عرب کے ایک عالم انس تدمُری نے ''المبشر ون بالجنۃ المذکورون علی لسان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کتاب تصنیف کی ہے جس میں انہوں نے عشرہ مبشرہ سمیت ایسے ۲۷ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کا ذکر کیا ہے جن کے جنتی ہونے کی صراحت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی ہے یہ کتاب دار المقیس، بیروت،لبنان سے ۱۴۳۵ھ/ ۲۰۱۴ء کو ۲۸۴ صفحات پر چھپی ہے۔

تمام صحابہ جنتی ہیں: جبکہ نص قرآنی تمام صحابہ کرام علیھم الرضوان کے قطعی جنتی ہونے پر شاہد ہے ارشاد باری تعالی ہے۔

{وکلا وعد اللہ الحسنی}

ترجمہ کنز الایمان۔اور ان سب سے اللہ جنت کا وعدہ فرما چکا۔

(پارہ ۲۷،سورہ الحدید،آیت ۱۰)

امام مجاھد وقتادہ فرماتے ہیں آیت میں حسنی سے مراد جنت ہے۔

(البحر المحیط،الجز الثامن،صفحہ ۳۱۰)

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی لکھتے ہیں اللہ نے ہر (صحابی) کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا ہے۔(الجامع الاحکام القرآن،الجز العشر ون،صفحہ ۲۴۳)

علامہ ابی الفضل احمد بن علی بن حجر عسقلانی لکھتے ہیں علامہ ابومحمد بن حزم نے فرمایا۔

"الصحابة كلهم من أهل الجنة قطعا"
تمام صحابہ کرام علیھم الرضوان قطعی جنتی ہیں۔
لا یدخل أحد منهم النار
ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ (الاصابۃ، الجزاول، صفحہ ۲۴)
جہنم کی آگ نہ چھوئے گی:
بلکہ میرا ماننا ہے کہ صحابہ تو صحابہ ان کی صحبت بابرکت سے مستفیض ہونے والے مسلمانوں میں سے بھی کوئی جہنم کی بھنک نہ سنے گا کہ سردار دو جہان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا:
"لاتمس النار مسلما رانی اورانی من رانی"
اس مسلمان کو جہنم کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی جس نے میری زیارت کی یا میری زیارت کرنے والے (میرے صحابی) کی زیارت کی۔
(السنن الترمذی، کتاب المناقب، باب ماجاء فی فضل من رانی النبی، رقم الحدیث ۳۸۵۸)
اور یہ کلام اس ہستی سے صادر ہوا ہے جن کے متعلق اللہ رب العزت ارشادفرماتا ہے۔
{وماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی}
ترجمہ کنزالایمان۔ اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے۔ (پارہ ۲۷، سورہ النجم، آیت ۳۔۴)
بحث Believer پر نقد و تبصرہ
فتنہ کے خوف سے جائز کام بھی ترک کرنا ہوگا:
جب ملت اسلامیہ میں قتل و غارت گری عروج پر ہو اور فتنوں میں گھری ہو تو ایسے میں کسی نئے مسئلہ کو چھیڑ کر مسلمانوں کو مزید گروہ بندی میں داخل کرنا دین کی خدمت

نہیں بلکہ سوئے ہوئے فتنہ کو جگانے کے مترادف ہے (نعوذ باللہ من ذالک) عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے جس فعل سے مسلمانوں کے درمیان انتشار پھیلے اور علمی فضا مقدر ہو اس سے دور رہا جائے نا کہ اس کے جواز کے لیے غیر ضرور وغیر علمی دلائل گھڑے جائیں اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا فعل مبارک ہمارے لیے بہترین مثال ہے آپ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ کعبہ معظّمہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کردہ بنیادوں پر ہو مگر مسلمانوں پر فتنہ کے خوف سے اسے عملی جامہ نہ پہنایا اور فرمایا:

" لولا حداثه قومک بالکفر لنقضت البيت ثم لبنيته على اساس ابراهيم عليه السلام"

اے عائشہ رضی اللہ عنہا اگر تیری قوم سے زمانہ کفر قریب نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو شہید کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔

(الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب فضل مکة و بنیانها، رقم الحدیث ۱۵۸۵)

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کا یہ فرمان سن رکھا تھا تو اپنے دور خلافت میں انہوں نے اسے حضور ﷺ کی خواہش کے پیش نظر حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کیا پھر حجاج بن یوسف نے مکہ مکرمہ پر غلبہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے بعد عبدالملک بن مروان کے حکم پر اسے دوبارہ اسی طرز پر تعمیر کر دیا جس طرز پر حضور ﷺ کے بچپن میں قریش مکہ نے کیا تھا جبکہ خلیفہ ہارون رشید نے اپنے زمانہ خلافت میں سیدنا امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے کعبہ معظّمہ کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرز پر تعمیر کرنے کا فتویٰ چاہا تو آپ نے باوجود اس کے کہ حضور ﷺ کی ہر سنت و خواہش کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے انہیں اس کام سے منع رہنے کا حکم دیا صرف اس بات کے پیش نظر کہ آنے والے حکمران اپنی شہرت کے پیش نظر کعبہ معظّمہ کو

شہید اور از سر نو تعمیر کرتے رہیں گے اس طرح نہ صرف کعبہ کی عظمت کم ہو گی بلکہ مسلمانوں میں فتنہ کا بھی سبب بنے گا۔ (بلدالامین صفحہ ۵۶)

کتاب ''مسئلہ تکفیر و متکلمین'' کا سبب تصنیف:

مولانا ذیشان احمد مصباحی کی کتاب مسئلہ تکفیر و متکلمین پاک و ہند سے شائع ہو چکی ہے جس کی کافی تشہیر بھی کی گی ہے کتاب تالیف کرنے کا بنیادی مقصد تکفیریت کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنا اور مطلقا تکفیریت کو جرم سمجھنے والوں کو تنبیہ کرنا ہے کتاب میں ایک بحث بی لیور اور نان بی لیور کی بھی ہے جس کا ذکر انہوں نے کتاب کی ابتداء میں دو جگہ کیا ہے جس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ یہ بحث دین کے مسلمہ اصول قطعیات میں سے نہیں ہے لہذا اس کی ترویج کرنے والے ڈاکٹر طاہر القادری کی تکفیر درست نہیں بلکہ ایک طرح ایسا نظریہ رکھنا درست، اور حالات کا متقاضی ہوسکتا ہے جس میں کوئی حرج نہیں ۔ ہمارا ماننا ہے کہ کتاب کے تمام مباحث اسی موقف کے دفاع کے گرد گھومتے ہیں ورنہ عصر حاضر میں اس کے علاوہ اور بھی کئی موضوعات تکفیر و عدم تکفیر کے متعلق علمائے کے درمیان زیر بحث ہیں۔مگر ان میں سے کسی کو بھی خصوصیت کے ساتھ نہیں لیا گیا جس طرح اس کو لیا ہے۔

Believer اور Non Believr کا لغوی معنی:

Believer انگلش زبان کا لفظ ہے اردو میں اس کے معنی اعتماد کرنے والا، بھروسہ کرنے والا، یقین رکھنے والا، عقیدہ رکھنے والا، مذہبی عقیدہ رکھنے والا اور مومن کے معنی میں مستعمل ہے جبکہ Non Believer اعتماد نہ کرنے والا، یقین نہ کرنے والا، اور کافر کے معنی میں لیا جاتا ہے۔

مولانا مصباحی کی تعریف:

مولانا مصباحی Believer اور Non Believer کے متعلق ایک جگہ لکھتے

ہیں۔کافر یاnon believer کا ایک اطلاق اسلامی مفہوم سے ماورا مطلقاً مذہبی اصطلاح کے طور پر بھی ہوتا ہے اس لحاظ سے کافر کا اطلاق ان افراد پر ہوتا ہے جو ایک خدا پر یقین نہیں رکھتے اس لحاظ سے دنیا کے تمام موحدین believer اور غیر کافر ہیں۔ (مسئلہ تکفیر و متکلمین۔صفحہ ۳۹)

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں believer کا اطلاق فقط موحدین پر ہی کیا ہے اور اس وقت روئے زمین پر صرف مسلمان ہی موحدین ہیں یہود و نصاری بھی دیگر کفار کی طرح مشرک اور کافر ہیں مومن نہیں جس پر آئندہ سطور میں بطور شاہد قرآنی آیات آرہی ہیں اور موحد ہونے کے لیے کسی کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غیر مشروط ایمان اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی اس طرح تصدیق کہ اس میں ذرہ بھر شک نہ ہو کے بغیر کفایت نہیں کرے گا بلکہ وہ موحد تب ہی مانا جائے گا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صدق دل سے ایمان لائے اور تصدیق کرے۔

اسی صفحہ پر تھوڑا آگے لکھتے ہیں اسلامی اصطلاح میں وہ تمام افراد کافر ہیں جو غیر مشروط طور پر نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی باتوں کی تصدیق نہ کریں۔(ایضا)

یہ وہی بات ہے جو ابھی ہم نے اوپر بیان کی ہے یہاں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب موحدین صرف مسلمان ہیں تو بی لیور اور نان بی لیور کی ایک اضافی اصطلاح وضع کر کے یہود و نصاری کو مومنین کی صف میں کھڑا کرنا پرلے درجہ کی غلطی اور ناکام کوشش ہے جسے مسلمانوں کی غالب اکثریت کسی صورت قبول نہیں کرے گی اور ویسے بھی موصوف نے اوپر موحد کا اطلاق جن پر کیا ہے ان کے تحت بھی یہود و نصاری کافر،غیر مسلم اور نان بی لیور ہی ٹھریں گے۔

تھوڑا آگے صرف ایک صفحہ چھوڑ کر اس بحث کو پھر نئے سرے سے شروع کیا ہے اور اس میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔

اول۔ بی لیور کا لغوی معنی:

اس میں لکھتے ہیں انگلش میں ایمان کو Belief اور مومن کو Believer کہا جاتا ہے۔ اصطلاح مذاہب میں ہر وہ شخص Believer ہے جو وجود خالق پر ایمان رکھتا ہے یا کسی ماورائی طاقت کو تسلیم کرتا ہے یا کسی مخصوص مذہبی و روحانی نظام میں یقین رکھتا ہے اس لحاظ سے یہود و نصاری، بلکہ ہنود و مجوس اور جینیوں اور بدھسٹوں پر بھی مومن کا اطلاق درست ہوسکتا ہے A Dictionary of Religious Terms میں Believer کے معنی مومن اور موحد دونوں لکھے ہیں۔ (ایضاً۔صفحہ ۳۹)

دوم۔ بی لیور کا اسلامی مفہوم بیان کیا ہے:

لکھتے ہیں اس اعتبار سے مومن اور Believer وہ ہے جو ذات رسالت پر یقین رکھتا ہے اور ان کی رسالت کی مکمل تصدیق کرتا ہے جو رسالت محمدی پر یقین نہیں رکھتا وہ دائرہ ایمان سے خارج اور مرض کفر میں مبتلا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ملحدین و مشرکین، مجوس و اہل کتاب، یہود و نصاری سب کفار کے زمرے میں ہیں جب تک ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے۔ (ایضاً صفحہ ۴۲)

دو متضاد موقف:

اس موقف پر تو کوئی اعتراض نہیں۔ اب لوٹتے ہیں پچھلی عبارات کی طرف آپ غور کریں موصوف نے پہلے بی لیور کی تعریف میں مومن ہونے کے لیے ایک خدا پر یقین رکھنے کی شرط لگائی ہے اسے اور آسان کر لیں مومن صرف وہی ہوگا جو صرف ایک خدا وحدہ لا شریک لہ پر ایمان لائے۔ (نوٹ۔ اس اصطلاح کو انہوں نے اسلامی مفہوم سے ماورا مطلقاً مذہبی اصطلاح کے طور پر بیان کیا ہے) جبکہ دوسری جگہ اس کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے جو اس کی تعریف کی ہے وہاں سے ایک خدا پر ایمان لانے کی قید ہٹا دی ہے اور اسی بناء پر انہوں نے یہود، ہنود، نصاری، مجوس،

جینیوں اور بدھسٹوں کو بھی مومنین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے (نوٹ۔ پہلے کی طرح یہاں بھی انہوں نے اس اصطلاح کو اسلامی مفہوم سے ماورا مطلقا مذہبی اصطلاح کے طور پر پیش کیا ہے).اب انہوں نے ایک ہی بات پر دو متضاد موقف پیش کیے ہیں جو دو ہی وجہوں سے ہو سکتے ہیں اول جس اصطلاح کو وضح کر کے یہ اسے فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا مفہوم خود ان پر مکمل طور پر منکشف نہیں۔ (ہم حسن ظن رکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا۔) جب بات ایسی ہے تو آپ خود اندازہ کر لیں کہ ایسے نظریہ کی تبلیغ کیونکر صیح ہوگی؟

دوم۔ الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ دجل سے کام لیا گیا اور یہود و نصاری کو مومنین کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے غیر اسلامی اصطلاح کو لغت کی آڑ میں مسلمانوں کے ذہنوں میں ڈال کر انہیں اس مفہوم سے دور کرنے کی کوشش ہے جو ان کے ذہنوں میں کفار کے متعلق پایا جاتا ہے اور فتنہ کو قصدا ہوا دینے کی کوشش ہے۔

اس کے کیا نقصانات ہوں گے؟ ان میں سے بعض کی طرف ہم آئندہ سطور میں نشاندہی کریں گے۔

بی لیور اور نان بی لیور ڈاکٹر طاہر القادری کے نزدیک۔

لگے ہاتھوں ڈاکٹر طاہر القادری کے الفاظ بھی پڑھتے جایئے جو انہوں نے اس قضیہ کو چھیڑتے وقت کہے تھے چنانچہ موصوف فرماتے ہیں۔

پوری دنیا میں جب تقسیم کی جاتی ہے تو Believers اور Non Believers کی تقسیم آتی ہے نان بی لیورز کو کفار کہتے ہیں علمی اصطلاح میں۔ اور بی لیورز ان کو کہتے ہیں جو اللہ کی بھیجی ہوئی وحی پر، آسمانی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں۔ مذہب ان کا کوئی بھی ہو۔ تو جب بی لیورز اور نان بی لیورز کی تقسیم ہوتی ہے تو یہودی عقیدے کے ماننے والے لوگ اور مسیحی برادری اور مسلمان یہ تین

مذاہب بی لیورز میں شمار ہوتے ہیں یہ کفار میں شمار نہیں ہوتے۔اور جو کسی بھی آسمانی کتاب پر، آسمانی نبی اور پیغمبر پر ایمان نہیں لاتے وہ نان بی لیورز کے زمرے میں آتے ہیں۔

ان کا یہ خطاب سی ڈی کی صورت میں اور یوٹیوب پر موجود ہے جہاں سے سنا جاسکتا ہے۔

قادری ومصباحی اصطلاحات:

اب مولانا ذیشان احمد مصباحی اور ڈاکٹر طاہر القادری کی تعریف پر ایک بار پھر سرسری نظر ڈال لیں۔

1۔ بی لیورز صرف موحدین ہیں (مصباحی)

2۔ بی لیورز میں وہ تمام افراد آتے ہیں جو وجود خالق پر ایمان رکھتے ہوں ماورائی طاقت کو تسلیم کرتے ہوں یا کسی روحانی نظام کو مانتے ہوں۔ (مصباحی)

3۔ بی لیورز میں یہودی، عیسائی اور مسلمان آتے ہیں (قادری)

تینوں تعریفات متضاد ہیں نیز مولانا ذیشان احمد مصباحی نے لغت کی قید لگائی ہے جبکہ ڈاکٹر طاہر القادری نے اسے علمی اصطلاح کہا ہے اور کسی قید کو ذکر نہیں کیا۔ ان کا اسے علمی اصطلاح کہنا، ماورائے اسلامی مفہوم مطلقا اصطلاح مذاہب میں نہ لینا اور مابعد مکمل کلام اس بات پر دال ہے کہ وہ یہود و نصاری کو کسی قید کے بغیر مطلقا اہل ایمان کے زمرہ میں رکھتے ہیں۔ علمی دنیا میں اصطلاحات کے اندر قیودات موضوع سے غیر ضروری چیزوں کو نکالنے کے لیے لگائی جاتی ہیں جبکہ یہاں ایسا کچھ نہیں ہے جس سے وہی سمجھا جائے گا جو ہم نے ابھی بیان کیا۔

مصباحی صاحب لغوی قید لگا کر کفار کو اہل ایمان کے زمرہ میں داخل کرنے میں ڈاکٹر طاہر القادری کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ انہوں نے تو صرف یہود، نصاری اور

مسلمانوں کومومن کہا جبکہ انہوں نے مجوس، ہنود وغیرہ کو بھی اسی صف میں لا کھڑا کیا۔

یہود ونصاری کافر ہیں:

مولانا مصباحی نے Believer کا جولغوی معنی بیان کر کے کفار پر مومن کا اطلاق کیا ہے اس پر ہم صرف اتنا کہیں گے بی لیور کا اطلاق صرف انگلش زبان میں ہی مستعمل ہے کفار اس لفظ کو کس معنی میں لیتے ہیں اس کا اعتبار نہیں۔ اعتبار اس کا ہے کہ اسلام ہمیں کفار کے متعلق کیا نظریہ رکھنے کا حکم دیتا ہے؟ اس جہت سے دیکھا جائے تو یہود ونصاری کے عدم ایمان اور کفر کا اعلان ہمارے رب عزوجل نے بڑے واضح انداز میں فرمایا ہے فرماتا ہے۔

{قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سوآء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا و لا یتخذ بعضنا بعضا او بابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔} (پارہ ۳،آل عمران آیت ۶۴)

ترجمہ کنزالایمان۔ تم فرماؤ اے کتابیو ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے یہ کہ عبادت نہ کریں مگر خدا کی اور اس کا شریک کسی کو نہ کریں اور ہم میں کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنالے اللہ کا سوا پھر اگر وہ نہ مانیں تو کہہ دو تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہود ونصاری موحدین میں سے نہیں ہیں وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور انہیں ایک اللہ کی عبادت کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے مگر انہوں نے اللہ کے حکم کو نہ مانا غیر اللہ کو اس کے ساتھ شریک ٹھرا کر شرک و کفر کیا۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

{و قالت الیھود عزیر ابن اللہ و قالت النصری المسیح ابن اللہ ذالک قولھم بافواھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل قتلھم اللہ انی یؤفکون۔ اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ و لمسیح ابن مریم و ما آمروا

الا لیعبدوا الھا واحد لآ الہ الا ھو سبحنہ عمارات یشر کون}

(پارہ۱۰،سورہ التوبہ آیت ۳۰۔۳۱)

ترجمہ کنزالایمان۔ یہودی بولے عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصرانی بولے مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ باتیں وہ اپنے منہ سے بکتے ہیں اگلے کافروں کی سی بات بناتے ہیں اللہ انہیں مارے کہاں اوندھے جاتے ہیں انہوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں کو اللہ کے سوا خدا بنالیا اور مسیح ابن مریم کو اور انھیں حکم نہ تھا مگر یہ کہ ایک اللہ کو پوجیں اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اسے پاکی ہے ان کے شرک سے۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ یہود و نصاری مشرک و کافر ہیں نہ موحدین میں سے ہیں اور نہ مومنین میں سے اب ایسے میں اگر کوئی انہیں مومنین میں داخل کرتا ہے تو گویا وہ قرآن اور اس جیسی دیگر آیات کا منکر ہو رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی أحد من ھذا الأمة یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی أرسلت بہ الا کان من اصحاب النار

(الصحیح للمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالة نبینا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...رقم الحدیث ۳۸٦)

اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے اس امت سے تعلق رکھنے والے کوئی بھی شخص خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی اگر اسے میرے بارے میں پتا چلا ہو پھر وہ مجھ پر ایمان لائے بغیر فوت ہو جائے تو وہ جہنم میں جائے گا۔

کیا عصر حاضر کے یہود و نصاری اہل کتاب ہیں؟

ایک سوال یہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ موجودہ دور کے یہود و نصاری پر اہل کتاب کا اطلاق درست ہے یا نہیں اور کیا ان پر قرآن وسنت کے احکام لاگو ہوں گے یا نہیں اور کیا اہل اسلام ان کے ساتھ دور اول کے اہل کتاب جیسا سلوک کریں گے یا نہیں؟

تو اس سلسلہ میں علماء کی غالب اکثریت انہیں اہل کتاب نہیں مانتی ان کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ عصر حاضر میں توراۃ وانجیل محفوظ نہیں رہیں کیونکہ یہود و نصاری کے مذہبی رہنماوں نے ان میں تحریفات کر کے مکمل بدل دیا ہے اب یہ ان کے من گھڑت قصوں اور جھوٹ پر مبنی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں چند احکام میں تبدیلی کی گی تھی مگر اب مکمل کتب کو ہی بدل دیا گیا ہے لہذا ان پر اہل کتاب کے احکامات لاگو نہیں ہوں گے۔ نیز ان کے ماننے والے برائے نام ہی عیسائی و یہودی ہیں کیونکہ ان کی غالب اکثریت ملحد ہو چکی ہے اگر کوئی معترض کہے کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے برائے نام مسلمان ہیں جو بنیادی اسلامی معلومات سے بھی محروم ہیں تو ہم کہیں گے کہ پھر بھی فرق ہے اگر کوئی عیسائی یا یہودی اپنے مذہب پر چلنا چاہے تو نہیں چل سکتا کیونکہ ان کی کتب میں تحریفات ہو چکی ہیں اور تعلیمات میں تضادات پائے جاتے ہیں جبکہ اسلام کی تعلیمات مکمل طور پر محفوظ ہیں ایک مسلمان جب چاہے ان پر عمل کر سکتا ہے۔

قضیہ بی لیور کے فروغ میں فسادات ہیں:

اگر ہم بی لیورز اور نان بی لیورز والے قضیہ کو تسلیم کرتے اور اسے فروغ دیتے ہیں تو درج ذیل فسادات لازم آتے ہیں۔

1۔ مسلمانوں میں فتنہ وفساد پھیلتا اور ملت اسلامیہ انتشار کی طرف جاتی ہے

2۔ ایک عام مسلمان کے ذہن میں ایمان وکفر کا جو تصور ہے اس کا خاتمہ ہوتا ہے کیونکہ وہ لغوی و اصطلاحی بحثوں کو نہیں جانتا ایک عام مسلمان اس اعتقاد کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے کہ آخرت مں نجات کا دارومدار اسلام کے دامن میں ہے دیگر مذاہب پر چلنا گو یا ابدی سزا کا مستحق ہونا ہے جو کہ حق ہے۔

3۔ جب اس قضیہ کو فروغ دیا جاے گا تو کفار ایک عام مسلمان کو یہود و نصاری

کے مومن ہونے کا دھوکا دے کر اسے اپنے مذہب پر ایمان لانے کی طرف دعوت دیں گے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو جائیں گے۔

4۔قادیانی اس کی آڑ میں خود کو مومن کہہ کر مسلمانوں کو قادیانیت کی طرف دعوت دیں گے۔

5۔آنے والے دنوں میں اس کی آڑ میں یہ بھی کہا جائے گا یہود و نصاری سے جہاد جائز نہیں کیونکہ وہ مومن ہیں اور مومن کا مومن سے قتال درست نہیں ہوتا۔

اسی جہت پر غور و فکر کرتے جائیں اور بھی بہت سی خرابیاں سامنے آ جائیں گی۔لہذا عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ اس مسئلہ کو یہیں دفن کر کے مسلمانوں کو مزید انتشار میں دھکیلنے سے بچا جائے یہی ہمارا مدعا ہے۔

مصری میڈیا:

قال مصباحی۔مصری میڈیا میں اہل کتاب پر مومن (Believer) کا اطلاق میں نے خود بھی سنا ہے۔(ایضا۔صفحہ ۴۱)

اقول۔اب ڈاکٹر طاہر القادری کے موقف کو تقویت پہنچانے کے لیے مصری میڈیا کا سہارا لیا جائے گا۔کسی بھی فرد سے مخفی نہیں کہ میڈیا پر زیادہ تر درباری اور تجدد پسند علماء کو لایا جاتا ہے اگر کسی جید عالم کا حوالہ دیں تو قابل توجہ بھی ہو۔ہمارے ہاں پاکستانی میڈیا پر جاوید احمد غامدی کافی مشہور ہے مختلف اسلامی موضوعات پر اس کے خطابات بڑے اہتمام سے چلائے جاتے ہیں ابھی چند دن قبل ہی انہوں نے بے اولاد والد کے لیے کرائے کی ماں کے جواز پر کلام کیا ہے اب اگر کوئی مصری عالم عرب میں کرائے کی ماں کے جواز کا موقف رکھے اور بطور دلیل غامدی کے خطاب کو پیش کرے تو اس پر ہنسنے اور افسوس کرنے کے علاوہ کیا کیا جا سکتا؟

(جاری ہے)

ماضی اور حال کے قائدین

فردین احمد خاں فرؔدین رضوی
(پیلی بھیت شریف، انڈیا)

سلطنت مغلیہ کے سب سے عظیم قائد، عسکری جرنیل، اور درویش صفت بادشاہ، سلطان محی الدین محمد اورنگزیب عالم گیر غازی جب دار فانی سے کوچ کر گیے، اپنے پیچھے متحدہ برصغیر کی ایک وسیع و عریض سلطنت چھوڑ گیے۔ جس میں ہندوستان، پاکستان، افغانستان، کشمیر اور بنگلا دیش شامل تھے۔ اپنی خدا داد عسکری صلاحیتوں کی بنا پر ہی سلطان عالمگیر مملکت متحدہ ہندوستان کو وجود میں لا سکے اور اسے ہر داخلی اور خارجی حملے سے محفوظ رکھ سکے۔ یہاں تک کہ ان کے تینوں بھائیوں نے ان کے خلاف جب اعلان بغاوت کیا تو انہوں نے سبھی کی سرکوبی کی اور ریاستوں کو ٹوٹنے اور باغی ہونے سے ہمیشہ پرے رکھا۔

مگر ستم ظریفی دیکھیں کہ جب ان کا انتقال سن 1707ء میں ہوا، اس کے بعد پئے در پئے ایسے قائدین کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ڈور آئی کہ جنہیں اپنی سُدھ بُد تھی نہ کوئی سیاسی شعور، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر کسی کی بھی بادشاہت زیادہ وقت تک نہ ٹک سکی اور اسی طرح سلطنت کا شیرازہ بکھرتا رہا۔ آپ یقین جانیے کہ بادشاہ عالمگیر کے انتقال یعنی سن 1707ء سے 1837ء لیکر تک پورے 130 سالوں میں 18 سلطان تخت نشین ہوے مگر کسی کے بھی عسکری، تعمیری یا دینی کارنامے تاریخ میں رقم نہیں ہیں۔ اس کے بعد ایک وقت وہ بھی آیا کہ سلطنت مغلیہ کو ایک قابل اور لائق سلطان ملا بھی لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، جب سلطان محمد بہادر شاہ ظؔفر غازی تخت نشین ہوے، ان کے آبا و اجداد، اس قدر عیش و عشرت میں سارا

سرمایہ اڑا چکے تھے کہ تمام ریاستیں ٹوٹ چکی تھیں، اور سلطنت سمٹ کر دہلی تک محدود رہ گئی تھی۔ تاریخ داں، اس آخری بادشاہ کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباو اجداد کی غلطیوں کا ازالہ نہ کرسکے اور بالآخر سلطنت زوال پذیر ہوگئی۔

اب اگر ذرا غور کریں تو ماضی کی یہ داستان ہم سے چیخ۔چیخ کر کچھ کہہ رہی ہے، ذرا کان لگا کر سنیں تو سہی! اور وہ پیغام بجز اس کے اور کیا ہے کہ جب زمام کار نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے تو سلطنتیں زوال پذیر ہوتی ہیں! اتنی بات اگر ذہن میں جما۔لی ہو تو یہ بھی سنیں کہ موجودہ حالات میں اس قدر تیزی سے اور خاص طور پر پچھلے پانچ سالوں میں اتنے علما، مشائخ اور مذہبی قائدین، دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گیے کہ بس الامان والحفیظ! ہمارے دار الافتاء، منبر اور محراب ماتم کُناں ہیں، کہ ان اجلہ عمائدین کی قلم کی جنبش، آواز کی سحر آفرینی اور جگر کا سوز محسوس کر سکیں۔ آہ! وہ درویش ہمارے بیچ اب نہ رہے! آہ! وہ مقدس اور پاکیزہ ہستیاں کس پردے میں جا چھپیں! قلم وسوز بیاں جن کا تھا مخلص ہر دم...... وہ ملت کے ستارے تو غروب ہو گیے...... پردہ فرما گیے...... ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیے...... ہاں ان سب کا روحانی فیض باقی ہے، ان کا فیضان جاری ہے مگر اب جب امت پر مشکل وقت پڑے گا، باطل کی آنکھوں میں آنکھیں کون ڈالے گا؟ ہماری مذہبی رہنمائی کون کرے گا؟ اور ان کے جانے سے پیدا ہوے خلا کو پُر کون کرے گا؟

اسی اثنا میں وہ سوال پیدا ہوتا ہے جو ہمیں بحیثیت ملّت بہت پہلے اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے تھا؛ کیا ہم واقعی قائدین پیدا کر رہے ہیں؟ آپسی اختلافات میں اس قدر گھل چکے ہیں، اپنی نفسیات کے اس قدر زیر اثر آ چکے ہیں کہ ہمیں اس جہت دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ مرے دوستوں وقت ہے کہ ہماری ملت کو نئے قائد پیدا کرنے کی ہوں گے......آج کے حالات کا اگر تجزیہ کریں تو جہاں بھی عمائدین دنیا

سے رخصت ہو رہے ہیں ان کے جانشین شاید بہت نیک لوگ ہیں، اچھی نیتیں رکھتے ہیں اور ملت کی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں پر سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنے آبا و اجداد جیسی 20 فیصد بھی صلاحیتوں کے حامل ہیں؟ میں کوئی فیصلہ نہیں دے رہا اور نہ ہی اپنا Judgement دے رہا ہوں، صرف سوال کر رہا ہوں جو ہمارے بڑوں کو خود سے پوچھنا ہے اور ملت کو جواب دینا ہے!

اس بات کو بھی پرکھنے کی کسوٹی ہمارے ماضی میں چھپی ہے، ذرا اوپر ذکر کردہ اس سطر پر پھر سے نظر ڈالیں: "پورے 130 سالوں میں 18 سلطان تخت نشین ہوئے مگر کسی کے بھی عسکری، تعمیری یا دینی کارنامے تاریخ میں رقم نہیں ہیں "شاید آپ کو اندازہ ہوا ہو کہ میں کس کسوٹی کی بات کر رہا ہوں؟ جی ہاں! کارنامے...... یعنی کہ اہل اور نا اہل کے بیچ کا فرق ہی یہ ہے کہ تخت پر صرف تخت نشین بننے کے لیے نہیں بیٹھا جاتا بلکہ اس کے لیے سلاطین جیسے معرکے بھی سر کرنے پڑتے ہیں، عسکری جرنیل بننے کے لیے میدان جنگ میں اترنا پڑتا ہے اور جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ ٹھیک ویسے ہی میرے پیارے! کسی درویش کی مسند میراث میں نہیں ملتی ...... اس کے لیے فنا کی منزلیں طے کرنی ہوتی ہیں...... معرفت کے جام پینے ہوتے ہیں، مراقبہ میں عمر گزارنی ہوتی ہے......اسی طرح عمائدین کا منبر بھی مفت میں نہیں ملتا......امامِ وقت ہونے کے لیے ویسی خدمات انجام دینی ہوتی ہیں، راستوں میں اتر کر، قوم کے بیچ رہ کر ان کے حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے فکر و نظر میں وہ بالیدگی پیدا کی جاتی ہے......ایئر کنڈیشن روم میں مجلسیں کر کے اور فائیو اسٹار ہوٹل سے بھی عمدہ حجرے میں بیٹھ کر پیغامات ارسال کرنے سے ملت کا درد کیسے دور ہو سکتا ہے؟ شاعرِ مشرق نے شاید یہی کچھ سوچا ہو گا جب انہوں نے یہ بات کہی۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر اَزبَر ہو
پھر پِسَر قابلِ میراثِ پِدَر کیوں کر ہو!

پوری گفتگو کا عِطر یہ ہے کہ، ہمارے قائدین جو تیزی سے رخصت ہو رہے ہیں ان کے بعد والوں کو اب یہ سوچنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے آبا کے مشن کو لیکر آگے نہیں بڑھ رہے...... اگر خدمتِ ملت میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کر رہے...... مسند پہ صرف مسند نشین بننے کے لیے بیٹھے ہیں...... تو وہ خود بھی اس ملت کے علمی ،فکری اور قومی زوال کے کہیں نہ کہیں ذمہ دار ہیں...... اورانہیں اگر کوئی نااہل کہہ بھی دے،تو اب وہ جانتے ہیں کہ اس کے ان جملوں کے پیچھے کون سے جذبات کارفرما ہیں...... بڑا بننے کے لیے بڑے کام کرنے پڑتے ہیں...... وراثت میں ملی ہوئی بڑائی زیادہ دن کی مہمان نہیں ہوتی...... ذمہ داریوں کو پورا کریں اور فرض منصبی کا لحاظ رکھیں...... تب ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے سچے جانشین ہیں۔بس انہیں کلمات پر اپنی گفتگو ختم کروں گا کہ ؎

خاکِ مشرق پر چمک جاے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

اللہ تبارک وتعالی ہم سب کو اپنے اسلاف کا سچا جانشین بنائے اور مذہب وملت کی خوب۔خوب خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یارب العلمین بجاہ النبی الامین علیہ وآلہ افضل الصلوۃ واکمل التسلیم

○○○

اقبال کی علماء وصوفیہ سے ملاقاتیں

علامہ اقبال پر معروف محقق وقلم کار محمد کاشف رضا کی زیرِ تکمیل کتاب کا ایک باب!!
تحقیق! محمد کاشف رضاؔ

حضرت میاں محمد بخش (کھڑی شریف)

ایک مرتبہ آپ (میاں محمد بخش) شہر لاہور میں قیام پذیر تھے کہ حضرت علامہ اقبال کے والد محبِ اولیاء اللہ تھے اور خاص طور پر حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ اقبال (جو اس وقت بچے تھے) کو لے کر دعا اور برکت کے لئے حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اقبال کے سر پر نہایت شفقت و پیار سے ہاتھ پھیرا اور ان کے والد کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا بچہ امتِ محمدی کا ایک نہایت دردمند دل ہوگا۔ اور شعر وسخن کے افق پر آفتاب بن کر چمکے گا۔ اس لئے لازم ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ اقبال کے والد محترم نے حضرت میاں صاحب سے عرض کی یا حضرت! یہ بہت ضدی ہے۔ اس پر میاں صاحب نے فرمایا کہ بڑے لوگ عموماً ضدی ہوا کرتے ہیں۔ آپ لوگ جس چیز کو ضد کہتے ہیں دراصل یہ دوسروں سے اپنی بات منوانے کا جوہر ہوتا ہے۔ یہ ملکہ انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے اور آپ لوگ اسے ضد کا نام دیتے ہیں۔ بچے کی اس بات پر آپ فکر نہ کریں یہ بچہ ایک دن بڑا آدمی بنے گا۔ اور تمام خاندان بلکہ ملت اسلامیہ کی عزت و وقار کا باعث ہوگا۔

(علامہ اقبال اور میاں محمد بخش کے افکار ونظریات کا تقابلی جائزہ، عابدہ خاتون، مطبوعہ مکتبہ جمال 2015ء لاہور)

قاضی سلطان محمود قادری (اعوان شریف گجرات)

علامہ اقبال کے والدِ محترم، قاضی صاحب کے مرید تھے۔ اپنے فرزند کو لیکر آستانہ عالیہ (اعوان شریف) پر حاضر ہوئے اور دعائے خیر کے لئے معروض ہوئے۔ قاضی صاحب نے ننھے محمد اقبال کے لئے دعا فرمائی اور کہا یہ لڑکا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا پیرو ہوگا''۔ (اقبال اور گجرات، ڈاکٹر منیر احمد سلیچ، سلیچ پبلی کیشنز ۱۹۹۸ء گجرات)

حضرت سید وارث علی شاہ (بانی سلسلہ وارثیہ دیوہ شریف)

پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے (بیرسٹر لاء لاہور) پر حضور انور (سید وارث علی شاہ) کا ایک واقعہ گزرا ہے جس کو انہوں نے درج نہ کرانے کے راقم الحروف کو مختلف وجوہ لکھے ہیں۔ ان میں ایک وجہ یہ بھی ظاہر فرمائی ہے کہ ''وہ واقعہ نہایت حیرت ناک ہے اور دنیا میں کوئی شخص اسکو تسلیم نہ کرے گا'' اس سے ظاہر ہے کہ حضور انور کے کمالاتِ صوری ومعنوی کا صرف مریدین کو احساس نہیں ہے بلکہ دیگر تعلیم یافتہ حضرات بھی متاثر ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے ہم لوگوں کے لئے قابلِ رشک ہیں کہ ان پر ایک خاص روحانی تجلی کا انکشاف ہوا اور وہ واقعہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ (معارفِ وارثیہ، شیخ فضل حسین صدیقی وارثی، مطبوعہ مطبع اخلاقی، ۱۹۱۹ء بانکی پور)

پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری (امیر ملت)

عرصہ تک اس امر کا کسی کو علم نہ تھا کہ علامہ کسی سلسلہ تصوف سے وابستہ بھی تھے یا نہیں۔ عام طور پر خیال کیا گیا تھا کہ مرحوم ایسی کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ لیکن سب

سے پہلے اس راز کی عقدہ کشائی امیر ملت اعلیٰ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب قبلہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مئی ۱۹۳۵ء میں فرمائی تھی۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ ''اقبال نے رازداری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ ''میں اپنے والدِ مرحوم سے بیعت ہوں'' حضرت فرماتے ہیں کہ ''اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے۔ وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا''

(سیرتِ اقبال، پروفیسر محمد طاہر فاروق مطبوعہ قومی کتب خانہ ۱۹۶۶ء لاہور)

''ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ لاہور کے ایک بڑے عام جلسہ میں علامہ ذرا دیر کر کے پہنچے کرسیاں بھری ہوئی تھیں، فرش پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کرسی پر بیٹھے تھے، آپ ان کے سامنے فرش پر آ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے ''اولیاء اللہ کے قدموں میں جگہ پانا بھی موجبِ فخر ہے'' حضرت نے تبسم فرمایا اور کہا ''اور اقبال جسکے قدموں میں آجائے اس کے فخر کا کیا ٹھکانا''

(سیرتِ اقبال، پروفیسر محمد طاہر فاروق مطبوعہ قومی کتب خانہ ۱۹۶۶ء لاہور)

مولانا شاہ حامد رضا خان بریلوی (فرزندِ اکبر امام احمد رضا بریلوی)

''اس مناظرہ کے موقع پر حضرت حجۃ الاسلام (مولانا حامد رضا) کی ملاقات ڈاکٹر اقبال سے بھی ہوئی اور ڈاکٹر اقبال کی ملاقات کا حال حضرت علامہ تقدس علی خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا ہے۔ جس کا عکس ''دعوتِ فکر'' از علامہ منشا تابش قصوری صفحہ ۳۵ پر چھپا بھی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کو جب حجۃ الاسلام نے دیوبندی مولوی کی گستاخانہ عبارتیں سنائیں تو وہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے اور بے ساختہ بولے کہ مولانا یہ ایسی عبارات گستاخانہ ہیں کہ ان لوگوں پر آسمان کیوں نہیں

ٹوٹ پڑا، ان پر آسمان ٹوٹ پڑ جانا چاہئے''

(پیش لفظ، فتاویٰ حامدیہ، مولانا حامد رضا بریلوی، مطبوعہ شبیر برادرز ۲۰۰۴ء لاہور)

مولانا اصغر علی روحی (سابقہ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

''اسی طرح مولانا اصغر علی روحی کو بھی ایک روز علامہ کی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ کوٹھی کے درمیانی حصے میں بیٹھے تھے اور حقے کی نے ہاتھ میں تھی۔ مولانا نے بے تکلفی سے حقے کا رُخ اپنی طرف کرلیا مگر معلوم ہوا کہ حقہ بُجھا ہوا ہے۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ میں تو حُقے سے محض باتیں کر رہا تھا۔ یہ کہہ کر علی بخش کو حقہ تازہ کر کے لانے کو کہا اور مولانا روحی اپنے مخصوص رنگ میں گفتگو کرنے لگے۔ بعض حوالوں کے سلسلے میں مولانا نے کہا کہ وہ لوگ بکتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مترادفات سے ایک ہی طرح کے معنی مقصود ہیں۔ نہیں، ہر لفظ الگ الگ اپنا خاص معنی اور مفہوم رکھتا ہے''

(اقبال کی صحبت میں، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مطبوعہ اقبال اکیڈمی ۱۹۷۷ء لاہور)

پروفیسر مولانا سید سلیمان اشرف بہاری

(سابقہ صدر دینیات علی گڑھ یونیورسٹی)

''المبین (مصنفہ مولانا سلیمان اشرف) شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھیجا تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لیکچروں کے سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہوگئی۔ المبین کا ذکر چھڑ گیا۔ سر اقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع ایسا آیا جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا۔ کہ مولانا

دوسرا ایڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطورِ ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہوگا''

(گنج ہائے گرانمایہ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مطبوعہ یونیورسٹی بک ڈپو راولپنڈی)

پروفیسر مولوی حاکم علی (سابقہ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور)

''مولوی حاکم علی اس زمانہ میں کالج کے پرنسپل تھے۔ اس لئے علامہ اقبال سے اُن کے براہِ راست تعلقات تھے۔ وہ کالج کے ضروری کاغذات ان سے منظوری حاصل کرنے کے لئے اپنے ذاتی ملازم علی بخش کے ہاتھ علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کیا کرتے تھے۔ انہی ملاقاتوں میں علامہ اقبال، علی بخش کی شرافت اور فرض شناسی سے متاثر ہوئے اور مولوی صاحب سے با قاعدہ مشورے اور اجازت سے علی بخش کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا''

(پروفیسر مولوی حاکم علی، پروفیسر محمد صدیق مطبوعہ مکتبہ رضویہ ۱۹۸۳ء لاہور)

پیر محمد ہاشم جان سرہندی (سجادہ نشین سرہند شریف)

''ایک مرتبہ چند احباب کے ساتھ سرہند شریف جاتے ہوئے لاہور پہنچا تو اقبال سے ملاقات کو دل چاہا، چنانچہ عصر کے وقت ملاقات کے لئے گیا۔ اقبال کو جب یہ معلوم ہوا کہ مجھ کو خاندانِ مجددیہ سے نسبتی تعلق ہے تو انہوں نے بڑی عزت افزائی فرمائی اور حضرت مجدد سے اپنی عقیدت کی ابتداء کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا۔ اقبال نے کہا کہ ''ایک مرتبہ میں حافظ عبدالحلیم کے ہاں چند احباب کے ساتھ بسی گیا ہوا تھا۔ واپسی کے وقت راستے میں سرہند پڑا، احباب حضرت مجدد کے مزار مبارک پر فاتحہ خوانی کے لئے گئے مجبوراً مجھے بھی جانا پڑا۔ سب لوگ مراقب ہو گئے میں بیٹھا رہا۔ اچانک مجھ پر رقت طارق ہوگئی۔ لرزنے لگا اور تھوڑی دیر بعد بے ہوش ہو گیا۔ جب

سب لوگ مراقبے سے فارغ ہوئے تو مجھ پر پانی چھڑکا اور میں ہوش میں آیا۔ اس روحانی تجربے کے بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ مزارات اولیاء فیضانِ الٰہی سے خالی نہیں ہوتے'' حضرت مولانا محمد ہاشم جان فرماتے ہیں کہ اقبال یہ واقعہ بیان کرتے اور روتے جاتے ان کا دل محبت سے معمور اور آنکھیں اشکبار تھی''

(حضرت مجدد الف ثانی اور ڈاکٹر محمد اقبال، پروفیسر محمد مسعود احمد، اسلامی کتب خانہ سیالکوٹ)

مولانا سید دیدار علی شاہ الوری (خطیب مسجد وزیر خان لاہور)

''حضرت مفتی اعظم پاکستان ابوالبرکات سید احمد قادری نے بیان کیا کہ ایک دفعہ علامہ اقبال الیکشن میں کھڑے ہوئے اور حضرت ابا جی (مولانا محمد دیدار علی شاہ) سے ملاقات کے لئے آئے، علامہ حضرت کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھے تھے، یُوں تو یاد نہیں کہ حضرت ''ابا جی'' کس مسئلے پر گفتگو فرما رہے تھے، لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ الٰہیات کے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے اور علامہ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا''

(تقریظ فتاویٰ دیداریہ، علامہ عبدالحکیم شرف قادری، مطبوعہ مکتبہ العصر ۱۴۲۸ء گجرات)

نور المشائخ مُلا شور بازار (شیخ طریقت، افغانستان)

معلوم ہوا کہ آج ان کی معرفت علامہ اقبال کی ملاقات ملا شور بازار سے ہونے والی ہے۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر ہم علامہ کے ہمراہ ان کی موٹر میں فلیمنگ روڈ پر میوہ منڈی کے سامنے ''امیر منزل'' میں گئے جہاں پر مُلا صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ راستے میں ہم نے مولانا غلام رسول مہر صاحب کو بھی ہمراہ لے لیا۔ جو ان دنوں اس سڑک پر رہتے تھے۔ ملا صاحب اس مکان کے ایک نمبر کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور یہ مکان ایک طرح میوہ منڈی والوں کا گودام تھا۔ مُلا شور بازار صاحب

نہایت احترام سے علامہ کے ساتھ اصحاب سرور کے دستور کے مطابق بغل گیر ہو کر ملے اور نہایت اخلاق سے پیش آئے۔نشست فرش پر تھی۔جب گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ اردو سمجھتے تو ضرور ہیں مگر آسانی سے گفتگو نہیں کر سکتے۔اسی طرح علامہ فارسی زبان کو خوب سمجھتے تھے مگر اس میں آزادانہ گفتگو کے عادی نہ تھے اور کسی قدر گھبراتے تھے۔مُلا صاحب نے فارسی میں پوچھا کہ آپ فارسی زبان میں گفتگو اچھی طرح کر سکتے ہیں؟ علامہ نے جواب دیا ''قدرے'' اس کے بعد تمام گفتگو فارسی زبان میں ہوئی۔علاوہ ازیں اس ملاقات میں بعض صوفیانہ مسائل بھی حضرت احمد سر ہندی کے حوالے سے زیر بحث آئے۔واضح رہے کہ علامہ مرحوم کو صوفیائے کرام اور علماء وصلحا سے ملنے کی ہمیشہ تمنا رہتی تھی اور خود ان کے مسکن پر ملاقات کر کے خوش ہوتے تھے'' (اقبال کی صحبت میں، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مطبوعہ لاہور)

علامہ سید احمد سعید کاظمی

(سابقہ شیخ الحدیث جامعہ انوار العلوم ملتان)

''علامہ اقبال کے دل میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدس کی عظمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ حُسنِ اتفاق تھا کہ ۱۹۳۱ء میں ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' کے مدرس کے حیثیت میں ایک جلسہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شرکت کے لئے گیا۔اس جلسہ کا اہتمام بیرون موچی دروازہ کیا گیا تھا۔ اقبال اس جلسہ کے صدر تھے اور یہ عرصہ دراز سے چلا آ رہا تھا کہ ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' کے مدرس اس جلسے میں مذہبی تقاریر کر رہے تھے۔جلسے سے قبل علامہ اقبال کا تعارف مجھ سے کرایا گیا، میں نے ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' پر سیر حاصل تقریر کی۔دورانِ جلسہ وہ اس قدر روئے کہ ہر دیکھنے والا یہ

محسوس کر رہا تھا کہ علامہ اقبال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں مخمور ہیں۔ جلسے کے اختتام پر انہوں نے کہا کہ ''آپ نے ہمیں آج روحانی غذا میسر کی ہے'' علامہ اقبال ذی علم تو تھے ہی مگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدس کی عظمت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ ان کی شاعری میں خالصتاً اسلام کا رنگ جھلکتا ہے''

(مقدمہ سید نور محمد قادری، صد سالہ تاریخ انجمنِ نعمانیہ لاہور'' مطبوعہ انجمن نعمانیہ ۲۰۱۲ء لاہور)

○○○

یہودی کا دماغ اور دل (۵۰۰ سے ۱۳۰۰ء تک)

ول ڈیورینٹ

مترجم: عبداللہ ملک

یہودی کی روح ہر زمانے میں ایک جارح دنیا میں اپنا راستہ بنانے کے عزم اور دماغی نشوونما کی طلب اور خواہش کے درمیان بٹی رہی ہے۔ ایک یہودی تاجر ہمیشہ عالم فاضل شخص ہوتا ہے۔ وہ اس شخص پر، جو دولت سمیٹنے کے بخار سے بچ کر امن کے ساتھ علم حاصل کرنے کا جویا ہو، رشک کرتا اور دل وجان سے اس کی عزت کرتا ہے۔ جو یہودی تاجر اور ساہوکار Troyes کے میلوں میں شرکت کرتے، راستے میں تلموذ کی تشریح اور تفسیر سننے کے لئے رک جاتے چنانچہ قرون وسطیٰ کے یہودی کاروباری مصروفیات، ذلت آمیز غربت یا عارضی تذلیل کے باوجود ماہرین لسانیات، علماء، صوفی، شاعر، سائنس دان اور فلسفی پیدا کرتے رہے۔ کچھ عرصہ تک (۱۱۵۰ سے ۱۲۰۰ عیسوی) خواندگی اور عقل ودانش کی دولت کے معاملے میں صرف مسلمان ان کے ہم پلہ تھے۔ انہیں اسلام کے ساتھ قریبی رابطوں کا فائدہ تھا۔ ان میں سے بہت سے یہودیوں نے عربی پڑھی تھی۔ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی اعلیٰ تہذیب وثقافت کی امین دنیا ان کے لئے کھلی تھی چنانچہ انہوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور قرآن مجید کو جو کچھ دیا تھا، اس کے عوض انہوں نے اسلام سے سائنس، طب اور فلسفہ لے لیا اور مغربی عیسائیت کے دماغ کو فکر عرب سے روشناس کرادیا۔

اسلام کے سائے میں رہنے والے یہودی گفتگو اور تحریری نثر میں عربی زبان استعمال کرتے البتہ ان کے شاعر بدستور عبرانی میں لکھتے رہے تاہم یہ شعراء عربی بحریں اور شعری اسلوب اختیار کرتے۔ مسیحی دنیا میں یہودی ان لوگوں کی زبان بولتے

جن میں وہ رہتے تھے لیکن وہ قدیم عبرانی میں ادب تخلیق کرتے اور یہیوا کی پرستش کرتے تھے۔ میمونائیڈز کے بعد اسپین کے یہودی، جو الموحدین کی عقوبتوں کے باعث فرار ہو گئے تھے، عربی کے بجائے عبرانی زبان کو ادبی ذریعہ اظہار بنانے لگے۔ عبرانی کے احیا کا دارومدار یہودی ماہرین لسانیات کی کوششوں پر تھا۔ حروف علت اور اوقاف ورموز نہ ہونے کے باعث عہد نامہ عتیق کا متن سمجھنا بہت مشکل تھا لیکن تین صدیوں کی عرق ریزی سے (ساتویں سے دسویں صدی) کوئی بھی خواندہ یہودی ان صحیفوں کو آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ عبرانی کی گرامر اور لغت نویسی کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے (۹۱۰،۷۰ء)۔ Menachem ben sarku کی شاعری اور علم وفضل کے باعث قرطبہ کا وزیر اعظم Hasdai ben shaprut اس جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے انجیل کی عبرانی ڈکشنری تیار کرنے کے کام کی حوصلہ افزائی کی۔ غرض Menachem کے شاگرد Jehuda ibn daud chayuj نے سائنسی بنیاد پر عبرانی کی لغت تیار کر لی (۱۱۱۰ عیسوی)۔

وسیع پیمانے پر پھیلے علم وفضل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عبرانی شاعری خوب پھلی پھولی۔ اس نے اپنی ہیئت اور موضوعی بندشوں کو فروغ دیا اور صرف مسلم اسپین میں ایسی تین شخصیتیں پیدا کیں جو اس زمانے کے مسلم یا عیسائی لٹریچر کی کسی بھی مثلث کے برابر تھیں۔ ان میں سے ایک Solomon ibn Gabirol تھا جسے عیسائی دنیا میں فلاسفر Avicebron کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نے ذاتی المیوں سے اسرائیل کے جذبات کو آواز دی۔ جیسا کہ ہائنے Heine کہتا ہے: ''وہ فلاسفروں میں شاعر اور شاعروں میں فلاسفر تھا۔'' وہ ۱۰۲۱ عیسوی میں ملاگا Malaga میں پیدا ہوا۔ بچپن میں ہی وہ والدین سے محروم ہو گیا اور اس قدر غربت میں پرورش پائی کہ چڑچڑا اپن

اس کی عادت میں شامل ہو گیا۔ وہ ہر وقت عالم استغراق میں کھویا رہتا۔ سارا گوسا Saragossa کی مسلم سٹی اسٹیٹ کا اعلیٰ عہدیدار Yakutiel ibn Hassan اس کے افکار سے متاثر ہو کر اسے اپنے ہاں لے آیا جہاں اسے کچھ دیر کے لئے راحت اور سکون میسر آیا لیکن امیر کے دشمنوں نے Yakutiel کو قتل کر دیا جس کے بعد Gabirol وہاں سے بھاگ گیا۔ وہ غربت اور بیماری کی حالت میں مسلم اسپین میں مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ جسمانی اعتبار سے اس قدر لاغر ہو گیا کہ ایک مکھی بھی اسے آسانی سے اٹھا سکتی تھی۔ Samuel ibn Naghdela نے، جو خود بھی شاعر تھا، غرناطہ میں اسے پناہ دی۔ یہاں Soloman نے اپنے فلسفیانہ افکار کو شعری قالب میں ڈھالا اور اپنے کلام میں عقل و دانش کی باتیں کیں:

ترجمہ: میں عقل و دانش سے کس طرح دست بردار ہو سکتا ہوں؟
میں نے اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا
وہ عورت میری ماں ہے، میں اس کا سب سے پیارا بچہ ہوں
اس نے میری گردن میں ہیرے جواہرات ڈال رکھے ہیں
ہر چند کہ یہ زندگی میری ہے لیکن میری روح بلند پروازی کے ذریعے
آسمان کی رفعتوں پر اس سے جا ملے گی......
میں جب تک اس کے منبعے اور ماخذ کو نہ پا لوں، آرام سے نہیں بیٹھوں گا

غالباً شدید احساس تفاخر کی بنا پر سیموئیل کے ساتھ اس کی لڑائی ہو گئی۔ عمر کے دوسرے عشرے کے آخر میں جب وہ ابھی جوان تھا، اس نے غربت کے عالم میں دوبارہ جہاں گردی شروع کر دی۔ قسمت نے اس کو عاجزی اور انکسار سکھا دیا اور وہ فلسفے سے مذہب کی طرف راغب ہو گیا:

ترجمہ: خدایا! انسان بھی کیا مخلوق ہے؟ قابل نفرت اور پاؤں تلے کچلا ہوا مردہ جسم

ایک ضرر رساں مخلوق جو سرتا پا مکروفریب سے بھری ہوئی ہے

ایسا پھول جو دھوپ کی تمازت سے مرجھا جاتا ہے

اس کی شاعری میں بعض اوقات حمد و مناجات کا رنگ غالب آجاتا ہے:

ترجمہ: خدایا ہمیں امن اور چین کی دولت سے بہرہ مند کر

ہمیں ایسی دل آویزی سے ہم کنار کر جو ہمیشہ برقرار رہے

ہمیں ایسی چیزوں سے کراہت نہ دلا

جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے

ہم یہاں وہاں ہمیشہ مارے مارے پھرتے ہیں

یا بے کیف جلاوطنی میں زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں

اس کے باوجود ہم جہاں بھی جائیں

اپنے آقا کی عظمت اور شان وہاں موجود ہوتی ہے

اس کی شہکار نظموں اور اللہ تعالیٰ کے بے پایاں لطف و عنایات کا تذکرہ ملتا ہے:

ترجمہ: میں تیری ہی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں

تو ہی میری جائے پناہ ہے

میں تیرے غضب سے بچنے کے لئے اس وقت تک تیرے سائے میں رہتا ہوں

جب تک تیرا قہر اپنا رخ نہیں موڑ لیتا

میں تیرے رحم و کرم کے ساتھ اس وقت تک چمٹا رہوگا

جب تک تجھے مجھ پر ترس نہیں آتا

جب تک تیری رحمت مجھ پر روشن و تاباں نہیں ہوتی

اس وقت تک میں تیرا دامن تھامے رہوں گا

مسلم اسپین میں یہودی کلچر کی آب و تاب اور کثیر الجہتی کی جھلک غرناطہ میں ابن

عذرا خاندان میں دیکھی جا سکتی تھی۔ جیکب ابن عذرا King Habbus کی حکومت میں اہم عہدے پر فائز تھا۔ اس کا گھر ادب اور فلسفے کا گہوارہ تھا۔ اس کے چاروں بیٹوں کی تعلیم و تربیت، علم و دانش کے ماحول میں ہوئی۔ ان میں سے تین نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ جوزف ریاست میں اعلیٰ عہدے پر مامور ہوا اور یہودیوں کی قیادت کرتا رہا۔ اسحاق ایک شاعر، سائنس دان اور ماہر تلمود تھا۔ موسیٰ ابن عذرا (۱۰۷۰ سے ۱۱۳۹ء) ایک اسکالر، فلسفی اور Halevi سے پہلے ایک نسل کا سب سے بڑا یہودی شاعر تھا۔ اس کی مسرت انگیز جوانی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب وہ اپنی ایک خوب صورت بھتیجی کی محبت میں گرفتار ہو گیا جس کے باپ نے (اس کا بڑا بھائی اسحاق) بیٹی کی شادی اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم کے ساتھ کر دی۔ موسیٰ نے غرناطہ کو خیر باد کہہ دیا۔ اجنبی علاقوں میں پھرتا رہا اور اپنی ناکام محبت کو شاعری کے ذریعے تسکین پہنچاتا رہا۔ ''ہر چند کہ تیرے لب دوسروں پر شہد گراتے ہیں تاکہ وہ اس سے چسکیاں لگائیں، تم سلامت رہو۔ عطر بیز سانسیں لیتی رہو تاکہ دوسرے انہیں سونگھ سکیں۔ گو کہ تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی لیکن میں آخری سانسوں تک تمہارا وفادار رہوں گا۔ میرا دل بلبل کے نغموں سے لطف اندوز ہوتا ہے حالانکہ اس کے یہ نغمے میرے دل کو تڑپاتے ہیں۔'' آخر میں وہ بھی Gabirol کی طرح تقدس آمیز شاعری کرنے لگا اور روحانیت اس کے شعروں پر غالب آ گئی۔

ابراہام بن مائر ابن عذرا، جسے براؤننگ Browning نے وکٹورین فلسفے کا نمائندہ قرار دیا ہے، موسیٰ ابن عذرا کا دور کا رشتے دار اور قریبی دوست تھا۔ وہ ۱۰۹۳ء میں طلیطلہ میں پیدا ہوا۔ اس کی جوانی بھوک سے آشنا تھی لیکن وہ ہر شعبے میں علم کا پیاسا تھا۔ وہ قریہ قریہ پھرا اور مختلف پیشے اپنائے لیکن ان سب میں ناکام ہوا۔ ''اگر میں موم بتیاں بنانے کا پیشہ اختیار کرتا'' اس نے یہودیوں کے تمسخرانہ انداز میں کہا: ''تو سورج

کبھی غروب نہ ہوتا، اگر میں کفن فروش ہوتا تو انسان ہمیشہ زندہ رہتے۔'' وہ مصر اور عراق سے ہوتا ہوا ایران پہنچا اور غالباً ہندوستان بھی گیا۔ پھر واپسی پر اٹلی، فرانس اور انگلستان گیا۔ ۷۵ برس کی عمر میں وہ واپس اسپین آ رہا تھا کہ راستے میں مر گیا۔ وہ اب بھی ایک غریب شخص تھا البتہ نظم اور نثر کے معاملے میں پوری یہودی دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اپنی جائے اقامت کی طرح اس کی تصانیف بھی مختلف موضوعات سے بدلتی رہیں۔ اس نے ریاضی، علم ہیئت، فلسفے اور مذہب پر کتابیں لکھیں۔ اس کی شاعری عشق و محبت اور دوستی، خدا اور فطرت، تشریح الابدان اور موسم، شطرنج اور ستاروں پر محیط ہے۔ اس نے مذاہب کے دور میں رائج ہمہ گیر نظریات کو شعری اسلوب میں ڈھالا اور عبرانی کی اس نظم میں نیومین Newman کا پیش رو ثابت ہوا:

ترجمہ: اے زمین اور آسمان کے خدا
روح اور جسم تیرے ہی وجود سے قائم دائم ہیں
تو نے انسان کو عقل و دانش کی نعمت بخشی
اور انسان کو روحانی نور عطا کیا......
میرے اوقات تیرے ہی ہاتھ میں ہیں
تو جانتا ہے کہ میرے لئے کیا بہتر ہے
اور میں جس جگہ کھڑے ہونے سے ڈرتا ہوں
تیری امداد وہاں میری دست گیری کرتی ہے
تیرا روحانی فیض میرے گناہوں کو چھپا دیتا ہے
تیرے رحم و کرم کی صفات ہی میری حفاظت کرتی ہیں
اور تیری بے پایاں عنایات ہی میری محافظ ہیں
تو کسی سے اپنی رحمت کا معاوضہ نہیں مانگتا

اس کے ہم عصر نامہ عتیق کی ہر کتاب کی تفسیر لکھنے پر اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔اس نے عبرانی صحیفوں کی صداقت کا دفاع کیا البتہ الوہی خواص کی استعاروں او رتشبیہوں کے طور پر تشریح کی۔اس نے پہلی مرتبہ یہ انکشاف کیا کہ انجیل کی Book of Isaiah دو پیغمبروں کی تصنیف ہے، ایک کی نہیں۔اسپینوزا Spinoza نے اسے بائبل کی عقلی تنقید کا بانی قرار دیا ہے۔

اس زمانے کا سب سے بڑا یورپی شاعر یہودا حلیوی Yehuda Halevi (۱۰۸۶ سے ۱۱۴۷ء) تھا۔وہ الفانسو پنجم کے Castile پر قبضے کے ایک سال بعد طلیطلہ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے عہد کی عیسائیت کے سب سے روشن خیال اور لبرل حکمران کے زیر سایہ تحفظ کے ماحول میں پروان چڑھا۔موسیٰ بن عذرا نے اس کی ایک ابتدائی نظم کو بہت پسند کیا اور بوڑھے شاعر نے اسے غرناطہ میں اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دے دی۔وہاں موسیٰ اور اسحاق بن عذرا نے کئی مہینوں تک اس کی مہمان نوازی کی۔اس دوران اسپین کے ہر یہودی گھرانے میں اس کے شعر بار بار پڑھے گئے اور اس کی منظوم بذلہ سنجی کی داد دی گئی۔اس نے عشق ومحبت پر مبنی کلام لکھا۔اس کی ایک شہکار نظم ذیل میں درج کی جاتی ہے:

ترجمہ: اے میرے محبوب نیچے اتر آ
تکیہ دار نشست سے الگ ہو کر
نیلوفر کے پھولوں کو اکٹھا کرو!
اس کے سینے میں مستور سیب سے
خوشبودار مہک آ رہی ہے
اس نے گلے کی مالا میں تمہارے لیے
روشنی کی طرح چمکتے ہوئے قیمتی پھل چھپا رکھے ہیں......

وہ شرم سے گلنار ہو جاتی ہے لیکن اس کا نقاب
آسمان کے ستاروں کی طرح دمک رہا ہے

ابن عذرا کی پر خلوص مہمان نوازی کو خیر باد کہہ کر حلیوی لوسینا Lucena چلا گیا جہاں اس نے یہودیوں کی ایک اکادمی میں کئی برسوں تک طب کا مطالعہ کیا اور نامور حکیم بن گیا۔ اس نے طلیطلہ میں عبرانی کی ایک درسگاہ قائم کی اور اس میں آسمانی صحیفوں پر لیکچر دیتا رہا۔ اس نے شادی کی اور اس کے چار بچے تھے۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی، اسے اپنی خوشحالی سے زیادہ اسرائیلیوں کے مصائب کا احساس ہونے لگا۔ بہت سے یہودیوں کی طرح فلسطین کی سرزمین میں مرنے کی آرزو اس کے سینے میں پرورش پانے لگی:

ترجمہ: اے دنیا کے پرشکوہ شہر (یوروشلم)
کاش میرے پَر ہوتے کہ میں اڑ کر وہاں پہنچ جاتا
یہاں تک کہ میں اپنے آنسوؤں سے اس خاک کی آبیاری کرتا
میرا دل مشرق میں اور میرا قیام مغرب میں ہے

اسپین کے آسودہ حال یہودی حلیوی کے ان جذبات کو شاعرانہ تعلّٰی سمجھتے رہے لیکن وہ ان کے اظہار میں مخلص تھا۔ ۱۱۴۱ء میں اس نے اپنے خاندان کو اچھے ہاتھوں کے سپرد کیا اور یوروشلم کی زیارت کے لئے روانہ ہو گیا لیکن ناموافق ہوائیں اس کے جہاز کو اسکندریہ لے گئیں۔ وہاں یہودیوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اس سے کہا کہ وہ یوروشلم نہ جائے جہاں اس وقت صلیبیوں کا قبضہ تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ Damietta اور Tyre روانہ ہو گیا اور پھر نامعلوم وجوہ کی بنا پر دمشق چلا گیا۔ وہاں وہ تاریخ سے غائب ہو گیا۔ روایات میں بتایا گیا ہے کہ وہ یوروشلم چلا گیا تھا جہاں اس نے جھک کر زمین کو چوما لیکن ایک عرب گھڑ سوار نے اسے کچل کر مار ڈالا۔ ہمیں یہ

معلوم نہیں کہ آیا وہ اپنے خوابوں کی سرزمین تک پہنچ بھی پایا تھا یا نہیں لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس نے دمشق میں زندگی کے آخری برس میں ''نغمہ یہود'' لکھا تھا جسے گوئٹے Goethe نے عالمی ادب کی عظیم نظم قرار دیا ہے:

ترجمہ: کیا تم یوروشلم کی وہ پہاڑی نہیں جس پر شہر داؤد تعمیر کیا گیا تھا
جسے تمہارے مقدس پتھر خوش آمدید کہتے ہیں
ایک اسیر خیالوں ہی خیالوں میں
تمہارے ریوڑ کی باقیات کو خوش آمدید کہتا ہے......
جب میں تمہارے مصائب پر گریہ وزاری کرتا ہوں تو میری آواز کرخت ہو جاتی ہے
لیکن جب میں خواب وخیال میں
تمہاری آزادی کو دیکھتا ہوں تو میری آواز میں نغمگی لوٹ آتی ہے
میرا نغمہ بربط کی طرح شیریں ہو جاتا ہے جیسے بابل کا جھرنا......
میں اس مقام کی طرف جا رہا ہوں جہاں پرانے وقتوں میں خدا کی روح
مقدس شخصیات پر کھل کر برستی تھی
یہاں میری روح بھی وفورِ جذبات سے لبریز ہو جاتی ہے
بادشاہوں کے محل اور خدا کا تاج بھی اسی مقام پر تھا
مقام افسوس ہے کہ اس جگہ جہاں اب غلام کھڑے ہیں
وہاں اس سے پہلے تیرے بادشاہ بیٹھا کرتے تھے
اب مجھے اس جگہ کون لے جائے گا
جہاں برس ہا برس پہلے
خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے
تیرے پیغمبروں اور پاک باز لوگوں پر نازل ہوا کرتے تھے

خدایا اب مجھے کون سا شخص وہ بال و پر دے گا
کہ میں اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں
وہاں میں تمام آوارہ منشیوں کو چھوڑ کر آرام سے بیٹھ جاؤں گا
میرا خانماں برباد دل ان کھنڈروں کے ساتھ لیٹ جائے گا
میں اپنے چہرے کو اس مقدس سرزمین پر جھکا دوں گا
جہاں کے پتھر قیمتی سونے کی مانند ہیں......
یہاں کی ہوا میری روح کے لئے زندگی کے مصداق ہے
ریت کے ذرے میرے نزدیک خوشبودار درخت کی مانند ہیں
تیری ندیوں سے شہد بہتا ہے
میں برہنہ پا اس حال میں تیری مقدس سرزمین کی طرف جاؤں گا
کہ لطف و سرور میرے انگ انگ میں بھرا ہوگا!
اس سرزمین میں جہاں نوح (علیہ السلام) کی کشتی ٹھہر گئی تھی
اے اسرائیل! تو حسن و جمال کا پیکر ہے
تیرے حسن میں عشق و محبت اور شان و شوکت دونوں یک جا ہیں!
تیرے ہم سفروں کی ارواح بڑی شفقت کے ساتھ
تیری طرف متوجہ ہوتی ہیں، وہ بڑی خوش وخرم ہیں
بہت دور وہ جلاوطنی کے ماحول میں گریہ وزاری کرتی ہیں
وہ ہمہ وقت تیرے لئے دعا کرتی رہتی ہیں
خدا کی خواہش ہے کہ وہ اپنی قامت گاہ میں رہے
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، اور انعام یافتہ ہے وہ شخص
جسے خدا نے عظمت کے لئے منتخب کر رکھا ہے

جسے تیرا قرب نصیب ہو وہ کس قدر خوش قسمت ہے
وہ ہر وقت تیرے نور سے اکتساب کرتا ہے
جس پر مشرق کے آسمانوں میں تیری صبح طلوع ہو
سب سے خوش نصیب وہ ہے جسے گناہ اور ذلت سے نجات ملے
اور جو بڑھاپے کے بعد تیری جوانی کا دوبارہ مشاہدہ کر سکے

تلمود کی مہم جوئیاں

اسپین کے سنہری دور میں یہودی اس قدر خوش حال اور مذہبی تھے جیسے انحطاط کے زمانے میں ان کے شاعر! انہوں نے پر وقار شاعری کے ساتھ ساتھ ایسا فلسفہ تشکیل دیا جس میں مقدس صحیفوں اور یونانی فکر کے درمیان گہری ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ جب متشدد الموحدین نے انہیں مسلم اسپین سے مسیحی اسپین کی طرف دھکیل دیا تو بھی یہودی بدستور مال دار رہے اور طلیطلہ، Gerona اور بارسلونا میں تیرہویں صدی کے دوران یہودیوں کی اکادمیاں پھلتی پھولتی رہیں لیکن فرانس اور جرمنی میں یہودی اس قدر خوش نصیب نہیں تھے۔ خوف و ہراس کے باعث وہ گھروں میں دبکے رہتے، ان کے بہترین دماغ تلمود کے مطالعے میں مصروف رہے۔ وہ سیکولر دنیا کے سامنے اپنے مذہبی عقائد پیش کرنے کی زحمت گوارہ نہ کرتے بلکہ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں قانون کے لئے وقف کر دیں۔

مینز Maintz میں ربی Gershom نے جس اکادمی کی بنیاد رکھی تھی اور جو اپنے زمانے کا سب سے بااثر مدرسہ تھا، اس میں سینکڑوں طلباء جمع رہتے۔ انہوں نے Gershom کے ساتھ مل کر دونسلوں کی محبت کے بعد تلمود کے متن کو آخری شکل دی۔ Rabi Shelomoh ben yitzha (۱۰۴۰ سے ۱۱۰۵ء) نے فرانس میں وہی کردار ادا کیا جسے Rashi کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ ٹرائز میں پیدا

ہوااور Maintz،Worms اور Speyer کی یہودی اکادمیوں میں تعلیم پائی۔ واپس ٹرائز پہنچ کر وہ شراب بیچ کر خاندان کا گزارہ کرتا رہا لیکن فرصت کے وقت وہ انجیل اور تلمود کو پڑھتا رہا۔ اگرچہ سرکاری طور پر اسے ربی تسلیم نہ کیا گیا، اس نے ٹرائز میں ایک اکادمی کی بنیاد رکھی جس میں وہ چالیس سال تک پڑھاتا رہا۔ اس نے عہد نامہ عتیق، مشنا اور Gemara پر کئی شرحیں لکھیں۔ اسپین کے دوسرے اسکالروں کے برعکس اس نے مذہب میں فلسفیانہ افکار کا مطالعہ نہ کیا بلکہ ان کی اس طرح تشریح کی کہ تلمود کی شرحیں اب تلمود کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ اس کے اعلیٰ کردار کی بدولت لوگ سینٹ کی طرح اس کا احترام کرتے۔ یورپ سے ہر جگہ سے یہودی برادریوں کے لوگ اسے مذہب اور قانون کے بارے میں سوالات بھیجتے اور اس کے جواب کو قانونی سند کا درجہ دیتے۔ پہلی صلیبی جنگ میں یہودیوں کے قتل عام نے اس کے بڑھانے کو مزید رنجیدہ و افسردہ بنا دیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے پوتوں سیموئیل، جیکب اور اسحاق بن مائر نے اس کا کام جاری رکھا۔

تلمود بہ مشکل مکمل ہوئی تھی کہ جسٹینین Justinian نے اسے غیر قانونی قرار دے دیا (۵۵۳ء)۔ اس کے نزدیک تلمود بچگانہ قصے کہانیوں، سخت بے انصافی، ہتک آمیز لغت، ملامت، الحاد اور مذہبی عقائد کی بے حرمتی کے واقعات کا مجموعہ تھی۔ اس نئی چرچ کے صرف چند علماء ہی عبرانی یا ارامی زبان پڑھ سکتے تھے جس میں یہ لکھی گئی تھی۔ غرض یہودیوں نے پورے سات سو برسوں تک تلمود کو دل سے لگائے رکھا اور اس عرصے میں وہ انجیل کو قطعاً فراموش کر بیٹھے۔ لیکن ۱۲۳۹ عیسوی میں عیسائیت اختیار کرنے والے ایک فرانسیسی یہودی Nicholas Donin نے پوپ گریگوری نہم کے سامنے تلمود کے کئی قابل اعتراض حصے پیش کئے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کے بارے میں توہین آمیز ریمارکس درج تھے۔ ان

اقتباسات میں یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ وہ عیسائیوں کے ساتھ بے ایمانی سے معاملات کریں۔ ان میں سے کئی الزامات درست تھے۔بعض ناراض ربیوں نے یہودیت کے عیسائی ناقدین کا ترکی بہ ترکی جواب دیا لیکن ڈونن نے، جواب پوپ سے زیادہ عیسائی تھا، ایسے کئی اور الزامات لگائے جن میں مضبوط دلائل موجود تھے: یہ کہ تلمود میں دھوکہ دینے کی کھلی چھٹی دی گئی ہے۔ایک عیسائی کو قتل کرنا،خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، قابل تحسین فعل ہے۔ان کے ربی حلف لینے کے باوجود یہودیوں کو وعدہ شکنی کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو عیسائی یہودی قانون کا مطالعہ کرے، اسے قتل کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ گریگوری نے فرانس، انگلستان اور اسپین میں تلمود کے تمام نسخے ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔اس نے راہبوں سے کہا کہ وہ ان نسخوں کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیں اور اگر یہ الزامات درست پائے جائیں تو انہیں جلا دیا جائے۔اس حکم کے بعد کیا واقعات پیش آئے،اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔

فرانس میں لوئیس نہم نے تمام یہودیوں کو ہدایت کی کہ وہ تلمود کے تمام نسخے اس کے حوالے کر دیں ورنہ انہیں پھانسی کی سزا دی جائے گی۔اس نے چار ربی پیرس طلب کر لیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ بادشاہ،ملکہ اور دو نامور فلسفیوں ولیم اور ایلبرٹس کے سامنے اس کتاب کا دفاع کریں۔تین روزہ انکوائری کے بعد بادشاہ نے تلمود کے تمام نسخے نذر آتش کرنے کا حکم دے دیا(۱۲۴۰ء)البتہ اسقف اعظم والٹر نے یہودیوں کی سفارش کی جس پر بادشاہ نے تلمود کے بعض نسخے ان کے مالکان کے پاس رہنے دیئے لیکن اس کے فوراً بعد اسقف اعظم وفات پا گیا اور کئی راہبوں نے یہ مشورہ دیا کہ تلمود کو جلانا خدائی فیصلہ ہے۔ اس مشورے پر لوئیس نے تلمود کے تمام نسخوں کو جلانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ۲۴ چھکڑوں پر تلمود کے نسخے پیرس لائے گئے جس کے بعد انہیں آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔

(جاری ہے)